زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

اشراق

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ

اگست ۲۰۲۳

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

جلد ۱ شمارہ ۱ اگست ۲۰۲۳ محرم ۱۴۴۵ھ

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

"اشراق امریکہ"—ہماری دعوتی روایت کی تجدید — سید منظور الحسن — 6

"اشراق آڈیو" — محمد حسن الیاس — 14

قرآنیات

البیان: الفاتحہ — جاوید احمد غامدی — 17

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 18

مقامات

میرا نام — جاوید احمد غامدی — 19

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (1) — سید منظور الحسن — 23

نقد و نظر

شعور اور تعلیمی اسناد — خورشید ندیم — 25

اوائل عمر میں تصور خدا کی تشکیل — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 29

اصلاح و دعوت

ایمان کا ذائقہ — محمد ذکوان ندوی — 34

نقطۂ نظر

سیاست و اقتدار اور اہل بیت کرام کا اسوہ — عمار خان ناصر — 36

ہندو مذہبی صحائف میں محمد ﷺ کی پیش گوئیاں — مشفق سلطان — 39

تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی مجوزہ حکمت عملی — سید منظور الحسن — 45

مختارات

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی — مولانا ابو الکلام آزاد — 56

نفس کا یہ دھوکا ہے — مولانا مناظر احسن — 61

شکایت ایک نفسیاتی کمزوری — مولانا وحید الدین خان — 63

ادبیات

اشہد ان لا الٰہ — جاوید احمد غامدی — 65

جوابی بیانیہ — فرحان سید — 66

صبحِ درخشاں (بچوں کے لیے)

کرن کاربن — نعیم بلوچ — 70

پانچ نمازیں (منظوم حدیث) — سید منظور الحسن — 73

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 75

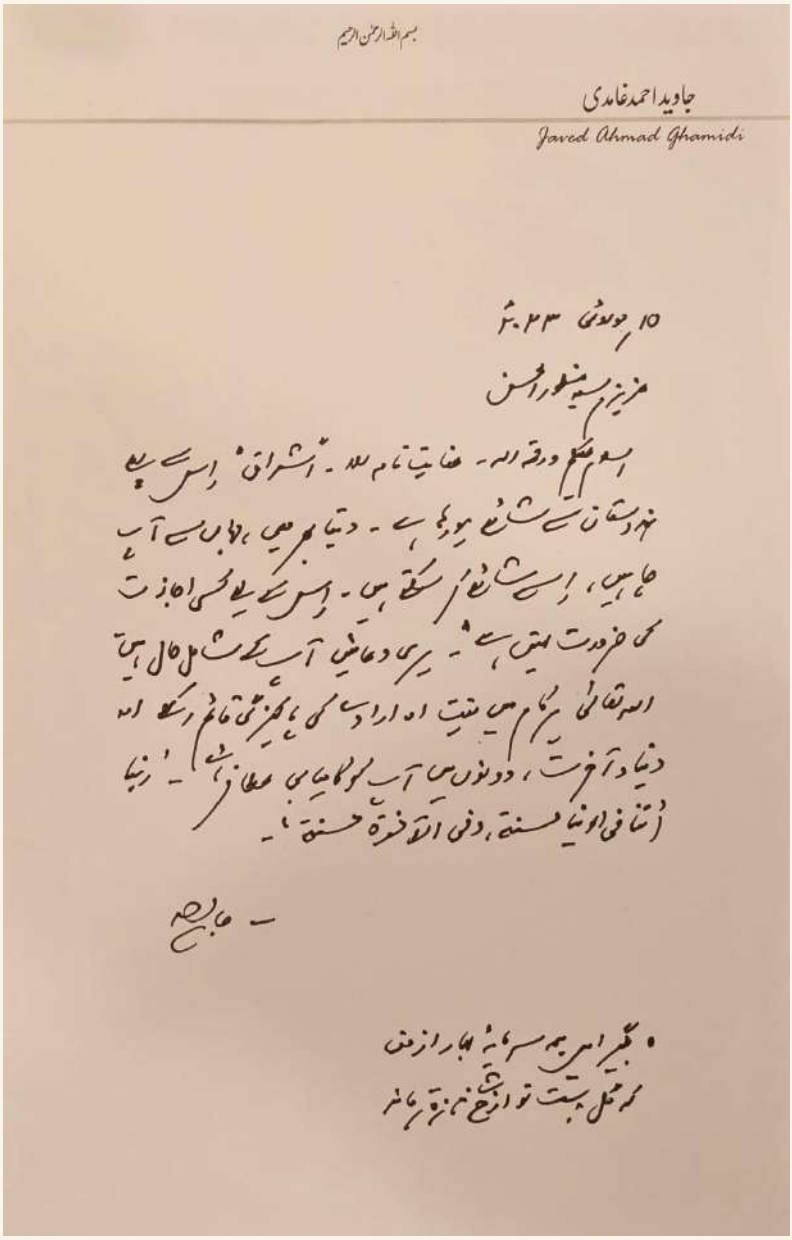

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جاوید احمد غامدی

Javed Ahmad Ghamidi

۱۰ جولائی ۲۰۲۳ء

عزیزم سید منظور الحسن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ ملا۔ "اشراق" اِس سے پہلے ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں، جہاں سے آپ چاہیں، اِسے شائع کر سکتے ہیں۔ اِس کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔* میری دعائیں آپ کے شامل حال ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کام میں نیت و ارادے کی پاکیزگی قائم رکھے اور دنیا و آخرت، دونوں میں آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ 'ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ، وفی الآخرۃ حسنۃ'۔

جاوید

* بگیر این ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

۱۵جولائی ۲۰۲۳ء

عزیزم سید منظور الحسن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ ملا۔ ”اشراق“ اِس سے پہلے ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں جہاں سے آپ چاہیں، اِسے شائع کر سکتے ہیں۔ اِس کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میری دعائیں آپ کے شامل حال ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کام میں نیت اور ارادے کی پاکیزگی قائم رکھے اور دنیا و آخرت، دونوں میں آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ ’ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ، وفی الآخرۃ حسنۃ‘۔

—— جاوید

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ ترماند[1]

۱۲جولائی ۲۰۲۳ء

واجبِ صد ہزار احترام استاذِ گرامی

السلام علیکم

یہ اطلاع آپ کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث ہو گی کہ ماہنامہ ”اشراق“ کی امریکہ سے اشاعت کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ادارت کے لیے میری خدمات حاضر ہیں اور انتظامی امور کا ذمہ ”المورد“ یو ایس نے لیا ہے۔ اِس بندوبست کے بعد اب آپ سے درخواست ہے کہ اِس کے اجرا کی اجازت عطا فرمائیں تاکہ یہ رسالہ ”المورد امریکہ“ کے ترجمان کا کردار ادا کر سکے۔ اجرا کی اجازت کے ساتھ سرپرستی اور رہنمائی کی استدعا بھی پیشِ خدمت ہے۔

---

[1]۔ میں بہار کا یہ سرمایہ لایا ہوں، تم اِسے لے لو۔ اِس لیے کہ پھول تمھارے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ شاخ سے بھی زیادہ تر و تازہ اور شاداب رہتا ہے۔

یہ درخواست اگر قبول ہوتی ہے تو میں دل و جان سے کوشش کروں گا کہ رسالے میں وہ دینی روایات، وہ اخلاقی اقدار اور وہ علمی معیارات ملحوظ رہیں، جن کی آپ نے تعلیم دی ہے اور جن کی روشنی میں میں گذشتہ 20 سالوں سے "اشراق" (پاکستان) کی ادارت کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ "المورد" یو ایس کے احباب بھی پورے جوش و جذبے سے پر امید ہیں کہ "اشراق امریکہ" اُس علمی روایت کو پروان چڑھائے گا، جسے "اشراق پاکستان" نے قائم کیا تھا اور "اشراق ہند" نے آگے بڑھایا تھا۔ ان شاءاللہ العزیز۔

والسلام

آپ کا شاگرد

منظور الحسن

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں
عالمِ نو ہے، ترے قلب و نظر تازہ کریں

سید منظور الحسن

”اشراق امریکہ“ ـــــ ہماری دعوتی روایت کی تجدید

ماہنامہ ”اشراق“ کو امام العصر جناب جاوید احمد غامدی کی دعوت کے ترجمان کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس کا پہلا شمارہ 50 سال پہلے مارچ 1973 میں لاہور (پاکستان) سے شائع ہوا تھا۔ اگلے 12 سال یہ حسبِ حالات وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ 1983ء میں ”المورد“ قائم ہوا تو اِسے اُس کے فکری نمایندے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ 1987ء میں اِس کا ڈیکلریشن استاذِ گرامی کے نام منتقل ہوا تو یہ باقاعدگی سے شائع ہونے لگا۔[1] بعد ازاں جب استاذِ گرامی کے فرزندِ ارجمند جواد احمد صاحب نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کو دعوتی کام کے لیے مختص کرنے کا فیصلہ کیا تو ”اشراق“ کی نگرانی کے جملہ امور اُنھیں سونپ دیے گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ اُنھیں حسبِ استطاعت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں اور ماہنامہ ”اشراق“ لاہور بلا انقطاع جاری و ساری ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔

اِس رسالے کے ادارتی اور انتظامی امور میں جن رفقا کا غیر معمولی کردار رہا ہے، اُن میں ڈاکٹر منیر احمد، شکیل الرحمٰن، طالب محسن، خورشید ندیم، نعیم بلوچ، معز امجد، محمد بلال اور قدیر شہزاد کے نام نمایاں ہیں۔ راقم الحروف کو بھی استاذِ گرامی نے اِس کی خدمت کا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ اُنھی کی سرپرستی اور رہنمائی میں کم و بیش 20 سال سے اِس کی ادارت کے فرائض بجالانے کا موقع میسر ہے۔ تدوین و طباعت میں معظم صفدر، نعیم احمد، شاہد محمود، شاہد رضا اور اظہر امیر کی

[1]۔ اس سے پہلے اِس کا ڈیکلریشن استاذِ گرامی کے رفیق ڈاکٹر مستنصر میر کے پاس تھا۔

خدمات گراں قدر ہیں۔ جن رجالِ کار نے اِسے لوگوں تک پہنچانے کے مشن کو اپنایا اور گھروں، دفتروں، دکانوں میں اِسے دستیاب کرنے کے لیے شب و روز جدوجہد کی، اُن میں دو شخصیات کا کردار غیر معمولی ہے: ایک محمد اسحاق ناگی مرحوم اور دوسرے ڈاکٹر حبیب الرحمٰن شہید۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کو اِسی کی خدمت کی بہ دولت شہادت کا رتبہ ملا۔ اللہ دونوں کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ ''اشراق'' کی تعمیر و ترقی اور اِس کا دوام و استحکام استاذِ گرامی اور اُن کے اِن رفقا و احباب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن کی اجتماعی مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اِن کے اخروی اجر کا وسیلہ بنائے۔ آمین۔

گذشتہ برسوں کے دوران میں جب دنیا کے مختلف ملکوں میں ''المورد'' کے انفرادی نظم قائم ہوئے تو پاکستان سے باہر اُن سب کاموں کی بنیاد پڑ گئی، جو ''المورد'' کے تصور کا لازمی جز ہیں۔ اِن نو تشکیل اداروں نے پاکستان میں قائم اولین ''المورد'' کو مثالی نمونہ (Role Model) بنایا اور اپنے افرادی اور مالی وسائل کی رعایت سے تصنیف و تالیف، تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کے کاموں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اِن کے مؤسسین اور منتظمین نے اپنے کاموں کو اُنھی خطوط پر استوار کیا، جن پر اولین ''المورد'' کو قائم کیا گیا تھا اور اُنھیں اُنھی ناموں سے موسوم کیا، جو استاذِ گرامی کے ساتھ نسبت کو ظاہر کرتے تھے یا اُن کے کاموں کی حیثیت سے معلوم و معروف تھے۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ کام اپنی ساخت، شناخت اور تعلق میں اُسی تحریک کا حصہ قرار پائیں، جس کا بیڑا استاذِ گرامی نے اٹھایا تھا اور اُسی روایت کا تواتر شمار ہوں، جو نصف صدی سے امام العصر کی اقتدا میں قائم ہے۔ اِس تناظر میں بعض اہلِ دعوت کو تمنا ہوئی کہ اگر اسباب میسر ہوں تو ہمارے دعوتی ترجمان ''اشراق'' کو بھی دیگر ممالک سے جاری کیا جائے۔ یہ تمنا پوری ہوئی اور اِس سلسلے کا اولین قدم ماہنامہ ''اشراق ہند'' کی صورت میں اٹھایا گیا۔ یہ 2017ء سے باقاعدگی سے جاری ہے۔ فاضل محقق اور عالمِ دین مولانا محمد ذکوان ندوی اِس کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پروردگار کا احسان ہے کہ ہندوستان کے بعد اب امریکہ سے بھی ''اشراق'' کے اجرا کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ اِن اسباب کی فراہمی ''المورد امریکہ'' کے رفقا اور ''غامدی سینٹر آف

اسلامک لرننگ'' کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب فرحان سید کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ اِس کی ادارت کے لیے میری ناچیز خدمات پیش ہیں۔

''اشراق امریکہ'' تحریر کے ساتھ آڈیو کی صورت میں بھی دستیاب ہے۔ یہ صورت ہمارے دعوتی کام میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اِس میں مصنفین کی تحریریں اُن کی اپنی آوازوں میں نشر ہوں گی۔ مقصود یہ ہے کہ دعوت کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور اِس کے ساتھ اُسے برصغیر پاک و ہند کے اُن کروڑوں لوگوں تک پہنچایا جائے، جو اردو رسم الخط سے ناواقفیت کے باعث اِس سے مستفید ہونے سے قاصر ہیں۔ ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کی روحِ رواں اور اُس کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن برادرم محمد حسن الیاس نے اِس جدت کو شاملِ حال کرنے کا عزم کیا ہے۔ وہ ''اشراق آڈیو'' کے مدیر کے فرائض انجام دیں گے۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے ''اشراق امریکہ'' کی سرپرستی کو قبول فرمایا ہے۔ ہمارے لیے اِس سے بڑھ کر شرف و اعزاز اور کیا ہو گا کہ ہمیں اپنے عہد کے امام کی رہنمائی میں دین کی خدمت کا موقع میسر ہے۔ دعا ہے کہ پروردگار اِس سے تادیر فیض یاب رکھے۔ آمین۔

''اشراق امریکہ'' صحافت کے میدان میں ہماری دعوت کا نقشِ ثالث ہے۔ ''اشراق پاکستان'' کو نقشِ اول اور ''اشراق ہند'' کو نقشِ ثانی کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا یہ اُسی سفر کا تیسرا سنگِ میل ہے، جس کا آغاز نصف صدی پہلے استاذِ گرامی نے کیا تھا۔ ہر نشانِ راہ جہاں راہ گزر کی صحیح سمت کا اطمینان دلاتا ہے، وہاں سامانِ سفر کی ترتیب اور عزمِ سفر کی تجدید کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ ''اشراق امریکہ'' کے آغاز کے موقع پر اِس تقاضے کو پورا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اُن اصولوں، اُن معیاروں اور اُن قدروں کی یاد دہانی کی جائے، جنھیں بانی ''اشراق'' نے قائم کیا اور اُن کے رفقانے دل و جان سے برقرار رکھا۔

یہ درجِ ذیل ہیں:

1۔ ''اشراق'' علما کے انذار کا ترجمان ہے

دین کی دعوت کا کام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے علما کو منتقل ہوا ہے۔ اِسے

قرآنِ مجید نے ''انذار'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی لوگوں کو اخروی زندگی کی تیاریوں کے لیے بیدار کیا جائے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تربیت کے اہتمام اور اُن کی نشر و اشاعت پر مبنی ہے۔ ''اشراق'' اِن کاموں کے جامع اور ناشر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

2۔ ''اشراق'' دین کی بے آمیز تعلیمات کا آئینہ دار ہے

دین اُسی صورت میں انسانوں کے لیے حجت قرار پاتا ہے، جب اُسے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی الہامی تعلیمات پر منحصر کیا جائے۔ آپ سے قبل و بعد کے انسانی علوم و افکار کی کوئی آمیزش اُس میں نہ ہونے دی جائے۔ چنانچہ ''اشراق'' کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دین کو فلسفہ، کلام، فقہ، تصوف اور تاریخ کی ملاوٹوں سے بالکل الگ کر کے بے کم و کاست اور خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر پیش کیا جائے۔

3۔ ''اشراق'' مدرسۂ فراہی کے اندازِ فکر کا نمایندہ ہے

دورِ حاضر میں امام حمید الدین فراہی، امام امین احسن اصلاحی اور امام جاوید احمد غامدی کا کام خالص قرآن و سنت پر مبنی ہے۔ مدرسۂ فراہی کے اِن جلیل القدر اہل علم نے اِس بات کو بہ طورِ اصول اختیار کیا ہے کہ دین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب تک محدود سمجھا جائے۔ نہ اِس میں کوئی کمی کی جائے، نہ اضافہ کیا جائے اور نہ اِس میں کسی فکر، کسی نظریے، کسی خیال کو در اندازی کی اجازت دی جائے۔ ''اشراق'' بعینہٖ اِس نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ لہٰذا اُسے مدرسۂ فراہی کے فکری نمایندے کی حیثیت حاصل ہے۔

4۔ ''اشراق'' حریتِ فکر کا علم بردار ہے

علم و فکر کی آزادی علم و فکر کی بقا کا ذریعہ ہے۔ اِسی سے علوم و فنون میں تعمیر و ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور انسان کے اُن پر اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس راہ میں اگر تقلید و تہدید اور جبر و اکراہ کی دیواریں کھڑی کر دی جائیں تو نہ صرف اِس کی ترقی کا سفر رک جاتا ہے، بلکہ اِس کا اعتبار بھی ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں گذشتہ چند صدیوں سے اِسی کا چلن ہے۔

چنانچہ مذہبی روایت دین سے مقدم اور معتبر ہو گئی ہے اور لوگ قرآن و سنت کو اُسی کی روشنی میں سمجھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اندھی تقلید کی یہ جامد روایت دین کی دعوت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا ''اشراق'' نے اِسے ببانگِ دہل چیلنج کیا ہے اور دینی علوم پر غور و فکر کی کامل آزادی کا علم بلند کیا ہے۔ اِس اعتبار سے یہ جریدہ دورِ حاضر کے مذہبی جبر و استبداد کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

5۔ ''اشراق'' علمی مکالمے کا حامی ہے

اہلِ علم کے مابین اتفاق و اختلاف علم کے سفر کا لازمی جز ہے۔ اتفاق و اختلاف کے لیے نقد و نظر اور بحث و مکالمہ ناگزیر ہے۔ علم کی دنیا میں اُسی اتفاق یا اختلاف کو وقعت ملتی ہے، جو تجزیہ و تحلیل کے بعد دلائل سے ثابت ہو۔ یہ سارا عمل علمی تبادلۂ خیال کو پروان چڑھاتا ہے۔ مکالمہ ایک صاحب علم کے سوال اور دوسرے کے جواب پر منحصر ہوتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں علم منتقل ہوتا اور صحیح اور غلط میں امتیاز کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ''اشراق'' اگرچہ مدرسۂ فراہی کے اندازِ فکر کا آئینہ دار ہے، مگر یہ دیگر مکاتبِ فکر کے ساتھ علمی تبادلۂ خیال کو ضروری سمجھتا ہے۔ اِس کے ''نقد و نظر'' اور ''نقطۂ نظر'' کے شعبے اِسی طرح کے مضامین کے لیے مختص ہیں۔

6۔ ''اشراق'' فرقہ بندی کا مخالف ہے

فرقہ بندی گروہی عصبیت پر مبنی ہوتی ہے۔ یعنی لوگ کسی گروہ یا جماعت کی حمایت علم و استدلال یا حق و صداقت کی بنا پر نہیں کرتے، بلکہ نسبت، تعلق اور وابستگی کی بنا پر کرتے ہیں۔ وابستگی بہ ذاتِ خود کوئی عیب نہیں، لیکن یہ اگر حق کے مقابلے میں ہو تو سراسر فساد ہے۔ پھر یہ معاشرے میں وہی فتنہ، وہی شر پیدا کرتی ہے، جو زمانۂ رسالت میں ابوجہل اور ابولہب نے پیدا کیا تھا۔ ہمارے ہاں یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے اور اُن کے لیے انکار، ارتداد اور تکفیر کے فتوے جاری کرتے ہیں اور نوبت یہ آ جاتی ہے کہ اُن کے خون کو مباح اور قتل کو واجب سمجھ لیا جاتا ہے۔ ''اشراق'' اِس تعصب اور فرقہ بندی کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ جاہلی عصبیت کی سنگلاخ پگ ڈنڈیوں کو چھوڑ کر اخوت و سلامتی کی ہموار شاہراہوں کو اختیار کریں۔

7۔ ''اشراق'' لوگوں کی انفرادی اصلاح کا نقیب ہے

دین چاہتا ہے کہ انسان کے علم و عمل کو آلایشوں سے پاک کر کے اُسے خدا کی ابدی جنت کا اہل بنایا جائے۔ اِس کے لیے سب سے بنیادی چیز خالق کے ساتھ بندگی کے تعلق کو پورے خلوص سے قائم کرنا ہے۔ اِس کے بعد مخلوق خدا کے ساتھ اپنے معاملات کو مبنی بر اخلاق رکھنا ہے۔ اِن دونوں پہلوؤں سے انسان کو وعظ و نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''اشراق'' اِسی تذکیر و تلقین کا مجموعہ ہے۔ خاص انفرادی تہذیبِ اخلاق کے پہلو سے اِس میں ''اصلاح و دعوت'' کا شعبہ مختص ہے۔

8۔ ''اشراق'' قوم کا ہم درد اور اُس کی غلطیوں کی اصلاح کا داعی ہے

اِس میں شبہ نہیں کہ ''اشراق'' علماے دین کا پلیٹ فارم ہے اور اِس بنا پر اُس کا اصل ہدف دعوت و انذار ہے، مگر خود دعوت کا تقاضا ہے کہ ملک و ملت کے دکھ درد میں شریک رہا جائے۔ اُنھیں تکلیف پہنچے تو محبت اور تسلی کا اظہار کیا جائے، وہ سرخ رو ہوں تو اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ وہ انتشار و افتراق کا شکار ہوں تو اخوت اور اتحاد کا درس دیا جائے۔ غفلت، جہالت اور اخلاقی پستی کے اندھیروں کی طرف گام زن ہوں تو عزم و ہمت، علم و ہنر اور ادب و اخلاق کے اجالوں کی طرف بلایا جائے۔ اِس مقصد کے لیے اُنھیں جھنجوڑا بھی جائے، ڈرایا بھی جائے، خبر دار بھی کیا جائے، مگر مایوس ہر گز نہ ہونے دیا جائے۔

مقامِ افسوس کہ مسلمان قوم علم و عمل کے انحطاط کا شکار ہے۔ اِس کے رہنماؤں نے جو حکمتِ عملی بھی اختیار کی ہے، اُس نے اِس میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی ہر حکمت عملی عقل کے بجاے جذبات اور اصولوں کے بجاے سطحی مفادات پر مبنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنے اپنے ملک میں قومی حیثیت سے منظم ہونے کے بجاے بے قابو گروہوں کی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ برِ صغیر اور بعض دیگر ممالک میں اُن کی سیاست، معیشت اور معاشرت تباہی کے دہانے تک پہنچ گئی ہے۔ اِس صورتِ حال میں ضروری ہے کہ اُنھیں اُن کی قومی اور اجتماعی غلطیوں کا احساس دلایا جائے اور اُن کی فوری اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہ کام اگرچہ ''اشراق'' کا اصل میدان نہیں ہے، مگر اِن معاملات میں اصولی رہنمائی اُس کی ذمہ داری ہے۔ اُس

نے اِس ذمہ داری کو نبھانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

9۔ ''اشراق'' معیاری زبان و بیان کا ضامن ہے

قرآنِ مجید شہ پارۂ ادب اور زبان و بیان کا عظیم معجزہ ہے۔ اُس کی دعوت کو پیش کرنے والی ہستی افصح العرب والعجم تھی۔ آپ کے جلیل القدر صحابہ بھی فصیح اللسان تھے۔ اُن کی اتباع میں سلف و خلف کے علما نے جب دین کی دعوت کو پیش کیا تو صحتِ زبان اور حسنِ کلام کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اردو زبان میں بھی دبستانِ شبلی کے تمام اہل قلم نے معیاری زبان و بیان کے التزام کو لازمی امر کے طور پر اختیار کیا۔ ''اشراق'' نے اِس روایت کو پوری محنت سے قائم رکھا ہے۔ اُس کے صفحات میں اسلوب کی ندرت، جملے کی سلاست، محاورے کی موزونی، املا کی درستی اور اوقاف کی پابندی کا ہر ممکن لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو دان طبقے میں اِسے معیاری اردو زبان کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

10۔ ''اشراق'' نو آموز قلم کاروں کی درس گاہ ہے

''اشراق'' نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہر نام ور ادیب، ہر بڑا انشا پرداز فنی تربیت اور مشق مزاولت کے بعد ہی معتبر ہوتا ہے۔ اعلیٰ جرائد نہ صرف ادیبوں کے کام کو متعارف کراتے ہیں، بلکہ باصلاحیت نوجوانوں کو صاحبِ طرز ادیب بنانے میں بھی کردار ادا کرتے ہیں۔ ''اشراق'' یہ خدمت برس ہا برس سے انجام دے رہا ہے۔ متعدد قلم کار ہیں، جنھوں نے ''اشراق'' سے لکھنے کا آغاز کیا، اُس کے تدوینی عمل سے بار بار اپنی تحریروں کو گزارا اور بالآخر صاحبِ کتاب مصنف کے مقام پر فائز ہوئے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو ''اشراق'' انشا پردازی کی ایک عظیم دانش گاہ ہے، جس میں دین کے طلبا علم و تحقیق، تصنیف و تالیف اور ترتیب و تدوین کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

یہ وہ بنیادی اصول، وہ لازمی معیارات اور وہ مستقل اقدار ہیں، جنھیں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے ''اشراق'' کی مستحکم روایت کے طور پر قائم کیا ہے۔ اِس روایت کو وجود بخشنے کے لیے اُنھوں نے صبر و برداشت کے خار زاروں میں عمر بھر آبلہ پائی کی ہے، تب کہیں جا کر سرو و

سمن پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کی نصف صدی کی خود نوشت اِن دو جملوں میں تحریر ہے:

ہوتا ہے روز راہ کے کانٹوں سے تار تار
سیتا ہوں اُن کی نوک سے پھر پیرہن کو میں
اِس دشتِ بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

لیکن یہ اُنھی کا کام ہے، اُنھی کا حوصلہ اور اُنھی کا مرتبہ ہے۔ ہم جیسے رہ نوردانِ شوق تو بس اُن کے نقشِ قدم کو چراغِ راہ ہی بنا سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ جستجو اور یہ آرزو کر سکتے ہیں:

تیرہ ہیں مہ و مہر تو ہم اپنے لہو سے
کر دیتے ہیں یہ بزم چراغاں کوئی دن اور
اِس دور میں سرمایۂ اربِ نظر بھی
اب ہو گا فراہی کا دبستاں، کوئی دن اور

محمد حسن الیاس

”اشراق آڈیو“

خدا نے انسانوں کو متنوع صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ فہم و ادراک، علم و ہنر، ذوق و شوق اور وصف و کمال میں ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے۔ حالات اور ذرائع و وسائل کا تفاوت اِس پر مستزاد ہے۔ اِس کا مقصد جہاں آزمایش ہے، وہاں تدبیرِ امور بھی ہے۔ چنانچہ یہاں ہر فرد کا ایک کردار ہے، جسے حسن و خوبی کے ساتھ نبھانا اُس کی ذمہ داری ہے۔ علم و استدلال اور غور و فکر بھی ایک خداداد صلاحیت ہے۔ ہر شخص اِس سے فیض یاب نہیں ہوتا۔ انسانوں کی بہت کم تعداد ہے، جو فکری اور نظریاتی معاملات میں غور و خوض کرتی اور مطالعۂ علوم میں دل چسپی لیتی ہے۔ یہ معاملہ تنہا آج کا نہیں ہے، ہر زمانے میں کتب بینوں کی تعداد اقلِ قلیل ہی رہی ہے۔

موجودہ زمانے میں مطالعے کا ذوق رکھنے والے طبقے میں یہ تعداد نہ صرف مزید گھٹی ہے، بلکہ اُن کی توجہ کا دورانیہ بھی کم ہوا ہے اور براہِ راست پڑھنے کی مہارت اور متون کے مطالعے کی صلاحیت بھی کمزور ہوئی ہے۔ اِس بات کی تائید جہاں ہمارا عمومی مشاہدہ کرتا ہے، وہیں اِس موضوع پر ہونے والی تحقیقات بھی اِس کی تصدیق کرتی ہیں۔ محققین اِس تبدیلی کی بنیادی وجہ ڈیجیٹل میڈیا کے وسیع پیمانے پر استعمال اور اخذ و استفادے کے لیے اسکرینوں پر بڑھتے ہوئے انحصار کو قرار دیتے ہیں۔

یہ صورتِ حال بہ ظاہر تشویش کا باعث ہے، لیکن اِس میں تسلی کا سامان بھی مضمر ہے۔ آج کی تیز رفتار دنیا میں معلومات کی ترسیل کے جدید آلات اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے تعلیم و تعلم کے اسالیب کو بہت حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کی آمد کے ساتھ، پڑھنے کے روایتی طریقے

اگرچہ محدود ہوئے ہیں، لیکن اِن کی جگہ سمع و بصر کے آلات نے لے لی ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے اب پڑھنے کے مقابلے میں سننے اور دیکھنے کے ذرائع کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اِس تبدیلی نے ملٹی میڈیا کو فروغ دیا ہے۔ پوڈکاسٹ، وی لاگز، ڈاکومنٹری، ڈرامہ سیریز، اینی میٹڈ موویز کے بعد اب ''آڈیو بکس'' مطالعے کے ایک متبادل کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ اعصابی نظام کے بارے میں جدید تحقیقات بھی یہ بتاتی ہیں کہ کتاب کی آڈیو سننا اُسے پڑھنے کے مقابلے میں دماغ کے زیادہ حصوں کو متحرک کرتا، اُسے زبان کی سمجھ اور یادداشت کے لیے فعال رکھتا اور تنقیدی سوچ اور استدلال کی مہارت کو بڑھاتا ہے۔ مزید برآں، سماعت کا طریقہ جب صوتی اثرات، آوازوں کے تنوع اور ساز و آہنگ سے مزین ہو تو جذبات، یاداشت اور حافظے پر اثر انداز ہوتا اور پڑھنے کے مقابلے میں زیادہ دل نشین، زیادہ عمیق اور زیادہ یادگار ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ تعلیم و تفہیم کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی تربیت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ چنانچہ آڈیوز سننے والے تلفظ، ادائیگی، لب و لہجے اور زیر و بم سے آشنا ہوتے اور علم کے ساتھ زبان بھی سیکھتے جاتے ہیں۔ ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ سننے والوں میں مصنف سے ایک نوعیت کی ملاقات کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اِس سے ربط و تعلق کا احساس پیدا ہوتا ہے اور لوگ زیادہ دل جمعی کے ساتھ علم و فکر سے وابستہ ہوتے ہیں۔

پھر یہ بھی امرِ واقعی ہے کہ افراد کی ایک بہت بڑی تعداد متن کو پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ مثلاً اردو زبان ہی کو لے لیجیے، ہندوستان کی سوا ارب آبادی کی اکثریت اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتی، لیکن اردو بولی یا پڑھی جائے تو اُسے بآسانی سمجھ لیتی ہے۔ آڈیو بکس نے اِن کروڑوں لوگوں تک معلومات کے ابلاغ اور علم و ادب کو جاننے کی راہیں کھول دی ہیں۔ دورِ حاضر میں جب انسان سماجی اور معاشی مشاغل میں حد درجہ مصروف ہو گیا ہے، یہ آڈیو بکس اُسے علم و فکر سے وابستہ رکھتی ہیں۔ روایتی مطالعے کے برعکس، جہاں غیر منقسم توجہ درکار ہوتی ہے، یہاں سامعین اپنے روزمرہ معمولات میں، ورزش کے دوران میں، کہیں سفر کرتے ہوئے، کسی انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے، پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے سمعی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ برصغیر کے معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی ایک لمبی مدت سے بصارت سے محروم ہیں۔ وہ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میں برس ہا برس سے پڑھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں، لیکن آڈیو بکس کی

سہولت کی وجہ سے مسلسل مطالعۂ کتب سے مستفید ہو رہا ہوں۔ جیسے جیسے دنیا ڈیجیٹل دور میں داخل ہو رہی ہے، آڈیو کتابوں کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ روایتی مطالعہ ہمیشہ اپنی جگہ برقرار رکھے گا، لیکن آڈیو کتابیں علم کے سفر کو زیادہ تیزی سے آگے بڑھائیں گی۔

جدید دور کے اِنھی ذرائع کی بنا پر اب یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دورِ حاضر میں علوم و فنون دورِ قدیم کے مقابلے میں زیادہ محفوظ اور زیادہ فیض رساں ہیں۔ مولانا وحید الدین خان نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اب صاحبِ علم کبھی نہیں مرے گا، کیونکہ جدید ذرائع ابلاغ نے عالم کی شخصیت کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

''اشراق'' ملتِ اسلامیہ کی عظیم علمی روایت کا ترجمان، ہمارے استاد جناب جاوید احمد غامدی کی 50 سالہ جدوجہد کا امین ایک علمی اور فکری مجلہ ہے۔ اُس کا یہ حق ہم پر واجب تھا کہ اُس کے ابلاغ کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے تاکہ اُس کا ولولہ انگیز اور انقلاب آفریں پیغام ہزاروں کے بجاے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں تک پہنچے۔ ''اشراق آڈیو'' اِسی حق کو ادا کرنے کا عزم ہے۔ ''المورد'' امریکہ کے زیرِ اہتمام ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کے رفقا کی جستجو ہے کہ دورِ حاضر کے اِس عظیم دعوتی مجلے کو جدید تقاضوں کے عین مطابق نئے انداز اور نئے آہنگ میں پیش کیا جائے۔ جو لوگ پڑھنا چاہیں، وہ پڑھ لیں اور جو پڑھنے کا موقع یا استعداد نہ رکھتے ہوں، وہ سن کر سمجھ لیں۔ طالبانِ دینِ حق اور رہروانِ علم و استدلال کے لیے یہ خبر یقیناً مژدۂ جاں فزا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے جلیل القدر عالمِ دین جناب جاوید احمد غامدی اور اُن کے فاضل تلامذہ کی تحریریں اُن کی اپنی آواز میں سنی جا سکیں گی اور اردو رسم الخط سے ناآشنا لوگ اب اُن کی گفتگوؤں کے ساتھ اُن کی تحریروں سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

روشنی کی جستجو ہوتی ہے جب ظلمات میں
دیکھ لیتے ہیں کلام اللہ کے آیات میں

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الفاتحۃ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝٦ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

شکر اللہ ہی کے لیے ہے، عالم کا پروردگار۔ سراسر رحمت، جس کی شفقت ابدی ہے۔ جو روزِ جزا کا مالک ہے۔ (پروردگار)، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش دے۔ اُن لوگوں کی راہ جن پر تو نے عنایت فرمائی ہے، جو نہ مغضوب ہوئے ہیں، نہ راہ سے بھٹکے ہیں۔

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایسے لوگ داخل ہوں گے، جن کے دل (نرمی اور لطافت میں) گویا پرندوں کے دل ہوں گے۔ (مسلم، رقم 5078)

— 2 —

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اُس شخص کے لیے سواد جنت میں ایک گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو جھگڑا چھوڑ دے، اگرچہ حق پر ہو۔ اور اُس شخص کے لیے وسط جنت میں گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو جھوٹ نہ بولے، اگرچہ ہنسی مذاق سے ہو۔ اور اُس شخص کے لیے بھی فردوس بریں میں گھر کی ضمانت دیتا ہوں جو اپنے اخلاق اچھے بنالے۔ (ابوداؤد، رقم 4169)

— 3 —

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس میں داخل ہونے والے زیادہ تر مساکین ہیں، جب کہ مال دار حساب کتاب کے لیے روک لیے گئے ہیں۔ (مسلم، رقم 4925)

مقامات

جاوید احمد غامدی

میرا نام

میرے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ والدہ کو ”جاوید“ پسند تھا۔ پیدایش کے بعد والد اپنے شیخ سے دعا کرانے کے لیے لے کر گئے تو اُنھوں نے فرمایا: اِس کا نام ہم درویشوں کے طریقے پر ہونا چاہیے۔ اِسے ”کاکو شاہ“ کہا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بادشاہ اِس کے پاس نیاز مندانہ حاضر ہوں گے۔ میری چھوٹی خالہ برسوں والدہ کے پاس رہی تھیں۔ والد اور والدہ، دونوں اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کے ایک بیٹے مجھ سے تین سال بڑے تھے جن کا نام اُنھوں نے ”رفیق“ رکھا تھا۔ اِس کی مناسبت سے اُنھیں اصرار تھا کہ میرا نام ”شفیق“ رکھا جائے۔ وہ اِس کے سوا کوئی دوسرا نام قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اِس کے کچھ دنوں بعد بڑی خالہ دیکھنے کے لیے آئیں تو اُنھوں نے فرمایا: میں نے تو پہلے سے اِس کا نام ”کاکا محمد“ رکھا ہوا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ میرے گھر والوں نے اِس کا آسان حل یہ تلاش کیا کہ تمام نام قبول کر لیے۔ چنانچہ یہ بزرگ جب تک زندہ رہے، مجھے اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے رہے۔

مدرسہ میں داخلے کا وقت آیا تو والد موجود نہ تھے۔ اُس زمانے میں بعض اوقات وہ مہینوں کے لیے اپنے شیخ کی خانقاہ کوٹلی مغلاں چلے جاتے تھے۔ اُن کے ایک عزیز دوست تھے جنھیں ہم چچا کہتے تھے۔ والد کی عدم موجودگی میں وہ مجھے داخل کرانے گئے۔ میرے لیے اُسی اسکول کا انتخاب کیا گیا

جس میں میرے خالہ زاد بھائی رفیق پڑھتے تھے۔ نام لکھاتے وقت چچا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سارے نام بتا دیے۔ وہ سخت پریشان ہوئے کہ اب فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ اُنھوں نے رفیق کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا: ہمارے گھر میں تو اِسے ''شفیق'' ہی کہتے ہیں۔ چچا نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر یہی نام اسکول کے رجسٹر میں درج کرا دیا۔

میں جب شعور کی عمر کو پہنچا تو مجھے والدہ کا رکھا ہوا نام زیادہ پسند آیا، لیکن اب اسکول کے رجسٹر کا کیا کیا جائے؟ اپنے ایک استاد محمد صادق صاحب سے بات کی تو اُنھوں نے فرمایا: اِس مرحلے پر نام تبدیل کرنا تو مشکل ہو گا۔ تمھیں شعر کہنے کا شوق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جاوید تخلص کر لو۔ میں تمھارا نام ''شفیق احمد جاوید'' لکھ دیتا ہوں۔ تمھیں ''شفیق'' پسند نہیں تو اپنا قلمی نام ''جاوید احمد'' بھی رکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ دوست احباب پہلے ہی ''جاوید'' کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ کالج کے زمانے سے اِسی نام کی شہرت ہو گئی۔ بعد میں شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بنانے کا موقع آیا تو سب جگہ یہی نام لکھا گیا۔

میں غالباً نویں جماعت میں تھا کہ اپنے ایک پھوپھی زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور آیا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ دس پندرہ دن تک بڑے چچا محمد لطیف خان صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اُنھیں اپنے والد اور میرے دادا نور الٰہی صاحب سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ رات دن وہ مجھے اُن کے قصے سناتے اور بتاتے تھے کہ گاؤں میں تمھارے دادا ایک مصلح کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اُن کی نیکی، خدا ترسی اور دانائی کی وجہ سے لوگ اپنے جھگڑے چکانے کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے اور اُن کا ہر فیصلہ مان لیتے تھے۔ اُن کی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ تاثر اتنا شدید تھا کہ میں ہر وقت دادا کے بارے میں سوچتا، یہاں تک کہ کئی دن تک سوتا تو خواب میں بھی اُنھی کو دیکھتا تھا۔

اِس موقع پر خاندان کے ایک دوسرے بزرگ اور بچوں کے لیے دینی کتابوں کے مصنف مقبول انور صاحب داؤدی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی یہ نسبت ہمارے گاؤں ''داؤد'' کی وجہ سے تھی۔ میرے والد کا پورا نام بھی اگرچہ محمد طفیل جنیدی تھا، لیکن بعض اوقات کوئی چیز اچانک متوجہ کر لیتی ہے۔ داؤدی صاحب سے ملنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ میرے نام کے ساتھ بھی اِس طرح کا کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔ لڑکپن میں ایسی خواہشیں بعض اوقات آدمی کے

ذہن پر سوار ہو جاتی ہیں۔ میں بھی دن رات یہی سوچتا۔ ایک دن والد صاحب سے اِس موضوع پر بات ہوئی تو اُنھوں نے مقبول صاحب کی اتباع میں ''داؤدی'' کا اضافہ کر لینے کی تجویز دی۔ پھر فرمایا: ہمارے شیخ سے بیعت کر لیتے تو ''جنیدی'' بھی ہو سکتے تھے۔ اِدھر میری خواہش تھی کہ یہ نسبت دادا سے ہو۔ چچا سے جو کچھ سن چکا تھا، اُس کی بنا پر اب میرے لیے وہی آئیڈیل تھے۔ میں اُن سے نسبت کے لیے سوچتا تو ''نوری'' اور ''مصلحی'' کے الفاظ ذہن میں آتے تھے، لیکن ذوق اُنھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اِسی حیص بیص میں تھا کہ دو بزرگ ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ والد کا معمول تھا کہ بارہا مہینوں کے لیے سیلانی فقیروں، اطبا اور سنیاسیوں کو اپنے ہاں مہمان ٹھیرا لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اِسی طرح آئے۔ اِن میں سے ایک والد کے پیر بھائی غلام رسول وحشی اور دوسرے کوئی عالم اور سنیاسی تھے جن کا نام عبد اللہ تھا۔ وحشی بہت اچھے کاتب تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ وہ اِسے سناتے اور اِس کی شرح و وضاحت میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرتے تھے۔ عبد اللہ صاحب کی دل چسپی عرب جاہلی کی تاریخ سے تھی۔ وہ اِس کے واقعات والد کو سناتے تھے۔ میں اِن بزرگوں کی مجلس میں گھنٹوں بیٹھتا اور بڑی دل چسپی کے ساتھ اُن کی باتیں سنتا تھا۔ عبد اللہ صاحب نے اِنھی مجلسوں میں کوئی قصہ سناتے ہوئے بیان کیا کہ بنو غامد کے ابو الآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اِس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اِسی بنا پر اُنھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا اور 'غمد الامر' کے الفاظ اِس کے بعد عربی زبان میں 'أصلح الامر' کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ جزیرہ نماے عرب میں اِسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے۔[1] مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہی کام تو میرے دادا کرتے تھے۔ اِس کے لیے یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بے حد مسرت ہوئی۔ والد سے ذکر ہوا تو اُنھوں نے بھی پسند کیا۔ میں ضلع ساہیوال کے جس دیہاتی ماحول میں رہتا تھا، وہاں اِس طرح کا نام مذاق بن جاتا۔ اِس لیے میں نے اِسے لکھنا تو بہت بعد میں شروع کیا، لیکن اُسی دن فیصلہ کر لیا کہ یہ لفظ اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔

---

[1] ۔ اِس کے بعد لغت کی کتابیں دیکھیں تو اِس کی تصدیق ہوئی۔ چنانچہ ''اقرب الموارد'' میں ہے: (غامدۃ) أبو قبیلة ینسب إلیها الغامدیون، وقیل: هو غامد وإسمه عمرو ولقب به لإصلاحه أمرًا کان بین قومه۔

بچپن، لڑکپن اور اوائل شباب کی خوشیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بعد میں سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس چیز نے علم و عمل اور فکر و خیال میں کیا اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دادا کے ساتھ نسبت کے لیے یہ لفظ مل جانے سے جو خوشی مجھے اُس وقت ہوئی، اُسے میں آج بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وقت کس طرح بدلتا ہے، اب بڑی سے بڑی بات بھی دل و دماغ میں اِس طرح کا کوئی اہتزاز پیدا نہیں کرتی۔ ایسی سب چیزیں عمر کے ساتھ کس قدر بے معنی ہو جاتی ہیں:

ہر روز ایک تازہ جہاں کی حکایتیں
اب رہ گئی ہیں قصۂ عہد شباب میں

[۲۰۰۷ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(1)

دیباچہ

''شق القمر'' کے زیرِ عنوان یہ تحریر استاذِ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کے موقف کا بیان ہے۔ اِسے اُن کی ویڈیو سیریز ''غامدی صاحب کے فکر پر 23 اعتراضات کے جواب میں'' کی اقساط 38 تا 39 سے اخذ کیا گیا ہے۔ اِس سیریز میں روایتی مذہبی فکر کے وہ اعتراضات زیرِ بحث ہیں، جو غامدی صاحب کے افکار پر بالعموم کیے گئے ہیں اور جنھیں علما کی اجماعی آرا کے مقابل میں اُن کے تفردات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ در حقیقت قرآن و سنت اور حدیث و سیرت کے مختلف مباحث کی رائج تعبیرات ہیں۔ غامدی صاحب نے اِنھیں قرآن و سنت کے نصوص اور حدیث و سیرت کے حقائق کے خلاف قرار دے کر جزواً یا کلیتاً قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔

اِس سلسلۂ مباحث میں سوال و جواب اور بحث و مکالمے کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ شریکِ گفتگو محمد حسن الیاس صاحب ہیں۔ اُنھوں نے تمام بحثوں کو بالاستیعاب ترتیب دے کر نہایت خوش اسلوبی

سے استاذِ گرامی کے سامنے پیش کیا ہے۔ استاذِ گرامی نے جوابی گفتگو میں روایتی نقطۂ نظر کی تشریح کی ہے، اُس کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے اور اُس کے مقابل میں اپنے موقف کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

راقم اِس سلسلۂ مباحث کو مقالات کی صورت میں تالیف کر رہا ہے۔ اِس کے لیے تفصیلی بحثیں اجزا میں تقسیم کی ہیں اور اشارات کی وضاحت اور اجمالی نکات کی تفصیل کی ہے۔ حسبِ موقع استاذِ گرامی کی تصانیف سے متعلقہ اقتباس نقل کیے ہیں۔ تشریح و توضیح اور تائید و تاکید کے لیے جلیل القدر اہل علم کی کتابوں کے حوالے بھی درج ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جو موضوعات آڈیو ویڈیو کی صورت میں دستیاب ہیں، وہ تحریری شکل میں بھی سامنے آ جائیں تاکہ طلبا اور محققین کے لیے اُن سے استفادہ آسان ہو جائے۔

یہ مقالات استاذِ گرامی کے افکار کے بارے میں راقم کے فہم کا بیان ہیں، تاہم خوش نصیبی ہے کہ یہ اُن کی نظر ثانی سے بھی گزر رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں فہم و بیان کے نمایاں تسامحات کی اصلاح ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔

دینی موضوعات پر استاذِ گرامی کے اعلیٰ علمی مباحث کو اُنھی کے مکالمات سے اخذ کر کے تحریر کرنا اور اِس مقصد کے لیے اُن کی اصولی رہنمائی کا میسر ہونا شرف و امتیاز کا باعث ہے۔ یہ پروردگار کی عظیم عنایت ہے، جو راقم کی اہلیت اور بساط سے یقیناً بہت بڑھ کر ہے۔ الحمد للہ۔

مذکورہ ویڈیو سیریز کی تشکیل اور اُس پر مبنی اِس سلسلۂ مقالات کی تالیف کا کام ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے زیرِ اہتمام جاری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارے اور افراد کی اِس اجتماعی کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین۔

[باقی]

خورشید ندیم

شعور اور تعلیمی اسناد

مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ شعور اور تعلیمی اسناد کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

جدید تعلیم اور شعورِ حیات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ مشاہدہ یہی ہے کہ یہ دو مختلف دھارے ہیں جو کم ہی مل پاتے ہیں۔ سماجی رویے اور معاملات میں، ایک سند یافتہ جسے عرفِ عام میں پڑھا لکھا کہا جاتا ہے، اس آدمی سے مختلف نہیں ہے جو ناخواندہ ہے۔ غصہ، خوشی، غم، مسرت، کسی موقع پر تقابل کر لیجیے۔ شاید ہی کوئی فرق تلاش کیا جا سکے۔ شادی کے موقع پر ہوائی فائرنگ کرنے والے اکثر پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ رہا علم تو اس کے نام پر ان خواتین و حضرات سے جو کچھ صادر ہوتا ہے، اس پر بہ مشکل ہی علم کا اطلاق ہوتا ہے۔

مذہبی تعلیم اور معرفتِ مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے مظاہر ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ یہ تزکیۂ نفس ہے، پیغمبر جس کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ مذہب اصلاً اسی کے لیے ہے۔ تزکیۂ نفس کیا ہے؟ تہذیبِ اخلاق۔ مذہبی اداروں سے فارغ التحصیل کو سب سے بڑھ کر اس کا علم بردار اور شخصی زندگی میں مظہر ہونا چاہیے۔ حقیقت کیا ہے، اس سے آپ بھی باخبر ہیں اور میں بھی۔ مذہب کے جو نمایندے ان مدارس سے نکلتے ہیں، الا ماشا اللہ، مذہب سے دوری ہی کا باعث بنتے ہیں۔

دوسری طرف روزمرہ زندگی میں ان گنت ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے کسی تعلیمی ادارے

کا منہ نہیں دیکھا ہوتا، لیکن علم اور تقویٰ کے پیکر ہوتے ہیں۔ جدید تعلیم سے کبھی واسطہ نہیں پڑا، لیکن معاملات نمٹانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔ پیچیدہ عقدے بیٹھے بٹھائے حل کر دیتے ہیں۔ گاؤں میں بارہا دیکھا کہ لوگوں کے باہمی تعلقات اتنے بگڑ گئے کہ بندوقیں نکل آئیں۔ معاملات اِن کے ہاتھ میں آئے جنھیں 'سیانے' کہتے ہیں تو یوں لگا جیسے کسی نے جلتی پر پانی ڈال دیا ہو۔

یہ معاملہ صرف اس طبقے کے ساتھ خاص نہیں ہے جو پاکستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھے ہیں۔ جو باہر سے سند لے کر آتے ہیں یا وہیں رہ رہے ہیں، ان کی فہم و فراست کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قومی سیاست کے حوالے سے پچھلے چند برسوں میں ایسے ایسے مظاہر دیکھنے اور سننے کو ملے کہ بارہا کانوں کو ہاتھ لگایا۔ اب تو ہاتھ بھی تھک گئے۔ ان کی باتیں سنیں تو ان پر کسی منطق کا اطلاق ہوتا ہے نہ کسی دوسرے عقلی پیمانے کا۔ کہنے کو ماڈرن ہیں۔ علم کی زبان میں کہیں تو جدیدیت کی پیداوار مگر باتیں سن کر لگتا ہے کہ ایک عرصے سے عقل کو طلاق دے چکے ہیں۔ جدیدیت تو کہتے ہیں کہ عقلیت پسندی اور سائنسی اندازِ نظر کی دین ہے۔ جدید اداروں کے یہ فارغ التحصیل، مگر ہوا میں قلعے تعمیر کرتے اور رومان پر سیاست کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ پاکستان کی تو سمجھ میں آتی ہے کہ اپنے تعلیمی نظام کے نقائص ہم سب پر واضح ہیں۔ ہمارے مقاصدِ تعلیم میں کبھی یہ مقصد شامل نہیں رہا کہ ہم نے عقلی بنیادوں پر سوچنے والا ایک اخلاقی انسان پیدا کرنا ہے۔ جدید علوم جن کی اساس عقل ہے، ہم صرف ازبر کراتے ہیں۔ مذہب کی تعلیم کا کوئی تعلق اخلاقیات سے نہیں۔ یہ پیشِ نظر ہی نہیں کہ عمر کے ساتھ کیسے بچے کے اخلاقی وجود کو مستحکم کرنا ہے۔ یوں ان نظام ہائے تعلیم کا فارغ التحصیل اگر قومی زندگی میں کبھی عقلی بنیادوں پر نہیں سوچتا، اور اخلاقی وجود کے باب میں حساس نہیں تو یہ اچنبھے کی بات نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ ایسا مغربی اداروں کے پڑھے لکھوں میں کیوں ہے جہاں عقلی بنیادوں پر سوچنا سکھایا جاتا ہے؟

میرے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو ہمارا شاکلہ یا یوں کہیے کہ ڈی این اے ہے۔ ہماری فطری ساخت کچھ اس طرح بن چکی ہے کہ ہم میں عقلی بنیادوں پر سوچنے کی صلاحیت تدریجاً کمزور ہوئی ہے۔ علامہ اقبال نے بیان کیا ہے کہ جو قوم طویل عرصہ غلامی میں رہتی ہے، اس کے سوچنے کا

انداز بدل جاتا ہے۔ مذہب، سماج، سیاست، ہم ہر معاملے کو جذبات کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ کم از کم گذشتہ تین سو سال سے ہمارے 'شاکلہ' کی تربیت اسی نہج پر ہوئی ہے۔ اب یہ ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکی۔ ہم جس تعلیمی نظام میں ڈال دیے جائیں، فی الجملہ اس کا نتیجہ ایک ہی ہو گا۔ دوسری وجہ مغرب کا تعلیمی نظام ہے۔ اُس میں بھی ایک بنیادی کمزوری ہے۔ انیسویں صدی میں، جب علم کی شعبہ جاتی تقسیم کا تصور آیا اور علوم کی تشکیلِ نو ہوئی تو تخصص (Specialization) کا حصول، تعلیم کا مطمحِ نظر ٹھیرا۔ تخصص کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ صرف اس شعبے کے علم تک محدود رہا جائے جس میں آپ تخصص چاہتے ہیں۔ اس طرح وحدتِ علم کا تصور کمزور ہوا اور علم کے دوسرے شعبوں سے بے اعتنائی نے زندگی کے ادھورے تصور کو فروغ دیا۔

تخصص علم کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ علم کے دوسرے شعبوں سے آدمی بے خبر ہی ہو جائے۔ بالخصوص وہ علوم جن کا تعلق معاشرت اور آدابِ معاشرت کے ساتھ ہے۔ مغرب میں اس کی کمی اس طرح پوری کی گئی کہ مختلف شعبوں کے ماہرین کو ایک چھت تلے جمع کر دیا جاتا ہے اور یوں زندگی میں وحدت پیدا کی جاتی ہے۔ اس طرح مکمل تلافی ممکن نہیں۔ نظام میں تو کسی حد تک اس کا تدارک ہو جاتا ہے مگر فرد میں جو کمی رہ جاتی ہے، وہ تادمِ آخر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا ایک مظہر ہمارے وہ ماہرین ہیں جو مغرب میں پڑھے ہیں مگر سماج اور زندگی کی ہمہ جہتی سے ناواقف ہیں۔

علم کو جب طبیعی (Natural) اور سماجی (Social) علوم میں تقسیم کیا گیا تو اس نے دو ایسے طبقات کو جنم دیا جو دو مختلف سیاروں کی مخلوق دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف فزکس میں کمال حاصل ہو گا اور دوسری طرف اس بات کی بھی خبر نہیں ہو گی کہ ملک کا وزیر اعظم کون ہے۔ ستم یہ ہوا کہ یہ طبقہ سیاست و معاشرت پر اپنی سطحی اور مصنوعی معلومات کے ساتھ، خود کو ان امور کا ماہر سمجھ بیٹھا اور یہ گمان کیا کہ اس نے اس سارے عمل کی حقیقت کو جان لیا ہے۔ لہٰذا اب اس کی بات کو حتمی سمجھا جائے۔ اس نے جسے کرپٹ مان لیا، اس کو کرپٹ نہ ماننا، کرپٹ ہونے کی دلیل ہے۔ واقعات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ یہ طبقہ حالات پر فیصلہ کن انداز میں اثر انداز ہونے کے قابل ہو گیا۔

جو آدمی رسمی تعلیم سے دور ہے مگر زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اس کا ذریعۂ علم اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ وہ کسی نظامِ تعلیم کے متعین حدود کا پابند نہیں۔ جب وہ زندگی کو سمجھتا ہے

تو اس کا علم فطرت سے قریب تر ہوتا ہے۔ اُس کے پاس معروف معنوں میں تعلیم نہیں ہوتی مگر شعور ہوتا ہے۔ یہ شعور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ سماج کی گتھیوں کو بہتر انداز میں سلجھا سکے۔

آج ضرورت ہے کہ تعلیم کو شعور سے جوڑا جائے۔ شعور تفہیمِ زندگی کی ایک داخلی صلاحیت ہے۔ تعلیم کا مقصد اس کو بیدار کرنا ہو۔ تخصص ضرور حاصل کیا جائے، لیکن اس سے پہلے زندگی اور علم کو ایک اکائی کے طور پر سمجھا جائے۔ اگر کسی قوم نے ووٹ سے یہ طے کرنا ہے کہ ملک کے سب سے بڑے انتظامی منصب پر کسے بٹھایا جائے تو لازم ہے کہ ووٹر کو زندگی اور سماج کا ایک عمومی شعور میسر ہو۔ یہ نظامِ تعلیم کا کام ہے کہ وہ یہ شعور پیدا کرے۔ بہ صورتِ دیگر سیاسی شعور کے نام پر جہالت بیچنے والے سب سے کامیاب سوداگر ہوں گے۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

اوائلِ عمر میں تصورِ خدا کی تشکیل میں والدین اور اساتذہ کے شخصی اثرات

بچے کے ذہن میں خدا کا ابتدائی تصور عموماً اس کے ماں، باپ اور اساتذہ کی شخصیات سے ماخوذ ہوتا ہے۔ ان ابتدائی تصورات کا تاثر اکثر اتنا گہرا اور پختہ ہوتا ہے کہ تمام عمر کے لیے خدا کے ساتھ ذاتی تعلق کی نوعیت طے کر دیتا ہے۔ ان شخصیات کے ساتھ شفقت، محبت، احترام، خوف، اطاعت اور نفرت کے عناصر، خدا کے ساتھ تعلق کے ذاتی احساس میں بغیر کسی شعوری کوشش کے پیوست ہو جاتے ہیں۔

ناظرہ قرآن کی ہماری استانی میرے لیے ایسی ہی ایک شخصیت تھیں۔ وہ محلے کی ایک بزرگ خاتون تھیں۔ انھیں بُوا جی کہتے تھے۔ وہ بڑے جثے کی ایک رعب دار خاتون تھیں۔ گھر کے کام کرتے کرتے ہمیں سبق بھی پڑھاتی جاتی تھیں۔ دل کی نرم اور زبان کی سخت تھیں۔ انھیں کبھی مارتے نہیں دیکھا تھا، اس کے باوجود ان سے ڈر لگتا تھا۔ ان میں بچوں کے لیے دبی دبی شفقت محسوس ہوتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو میرے دل میں ان سے ڈر نہیں، حیا تھی۔ چھٹی کر لیتا تو ان کا سامنا کرنے میں ڈر سے زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور شرمندگی کا یہ احساس میرے لیے ڈر سے زیادہ بھاری تھا۔

میرا تصورِ خدا بُوا جی جیسا تھا۔ ایک عظیم الجثّہ ہستی جو اپنے کام کرتے کرتے کائنات کا انتظام

بھی دیکھتی جاتی ہے۔ جو پردے میں رہ کر اپنے بندوں پر اپنی شفقت کا اظہار کرتی ہے۔ خدا سے مجھے ڈر سے زیادہ حیا آتی ہے۔ علم و آگہی کے ورود کے بعد خدا کا تصور بہت کچھ بدل گیا، لیکن حیا نما ڈر کا تاثر آج بھی ویسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

علمِ نفسیات کے مطابق بچہ اپنے لیے خدا کا پہلا تصور اپنے والدین سے اخذ کرتا ہے۔ پہلے ماں کی مہربان شخصیت سے خدا کا تصور کشید کرتا ہے اور پھر باپ کا تاثر اس کی جگہ لے لیتا ہے، جو ایک مربّی اور محافظ کا تصور ہے۔ باقی ساری عمر وہ اپنے باپ جیسے خدا کا تصور ذہن میں بسائے رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ماں، باپ ہی نہیں، اساتذہ کی شخصیت کا تاثر بھی خدا کا اولین تصور قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مسلمان بچے مولوی صاحب اور مسیحی بچے پادری صاحب کو خدا یا خدا کا روپ سمجھ لیتے ہیں۔

علم نفسیات کے مطابق انسان کا بچپن ساری عمر اس کے اندر زندہ رہتا ہے۔ یہ بات افراد ہی نہیں، اقوام کے معاملے میں بھی درست ہے۔ افراد اور اقوام کے مزاج اور نفسیات کے درست مطالعے کے لیے ان کے بچپن اور قومی تشخص کی تشکیل کے دور کا مطالعہ اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی فرد یا قوم کے دینی مزاج کے تشکیلی دور میں پائے جانے والے تصور خدا کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہر مذہبی روایت نے مادری اور پدری اصطلاحات میں خدا کے تصور کو پیش کیا ہے۔ مسیحیت میں خدا کے لیے باپ ہی کا لفظ اختیار کر لیا گیا۔ ہندو مت میں دیوتا، باپ جیسی اور دیویاں ماتا یعنی ماں جیسی ہستیاں مانی جاتی ہیں۔ دین اسلام کی روایت میں مخلوق کو ''اللہ کا کنبہ'' کہا گیا ہے۔ خدا کے لیے رب کا لفظ اختیار کیا گیا جو باپ اور سرپرست کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ہم اپنے لیے فرزندانِ توحید اور فرزندانِ اسلام کی تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک ضعیف روایت میں خدا کی محبت کا اندازہ ستر ماؤں کی محبت کے پیمانے سے بیان کیا جاتا ہے۔

ہمارے سماج میں علاقائی لحاظ سے دو بڑی مذہبی سماجی روایات پائی جاتی ہیں: ایک پختون علاقوں کی روایت، دوسری ہندوستانی علاقوں سے آنے والی روایت۔ پختون روایت میں باپ ایک سخت گیر شخصیت ہوتا ہے۔ اولاد سے اس کا تعلق ڈر، احترام اور اطاعت کے عناصر پر مشتمل ہوتا ہے۔ محبت فطری طور پر موجود ہوتی ہے، لیکن جذباتی حد کو نہیں چھوتی، دائرۂ اظہار میں نہیں

آتی۔ ادھر حفظ وناظرہ قرآن کے لیے ہر بچہ مدرسے یا مسجد میں قاری اور حافظ صاحبان سے دوبدو ہوتا ہے۔ یہاں اساتذہ میں بھی عمومی طور پر سختی پائی جاتی ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کا رواج ہے۔ اساتذہ کے ساتھ تعلق ادب، احترام، اطاعت، خوف، خدشے، بے زاری، لاتعلقی اور بعض صورتوں میں ظالم اور مظلوم کا ہوتا ہے۔

کم سنی میں مدارس میں داخل کرا دیے جانے والے بچے والدین سے دور رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ اپنا جذباتی تعلق پوری طرح استوار نہیں کر پاتے۔ والدین اور اساتذہ کے ساتھ تعلق کا یہ تاثر خدا کا تاثر تشکیل دیتا ہے اور اس تاثر میں خدا سے بھی جذباتی تعلق کمزور ہوتا ہے۔ اس میں بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ توحش کے احساسات شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بچے جو والدین کی شفقت اور محبت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لیتے ہیں، خدا کی محبت، رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ یہ ایک بڑی اور بنیادی وجہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے روایتی دینی طبقے میں دین پر عمل کے میدان میں ایک طرف خدا سے محبت اور رحمت کے احساس میں کمی دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ایسا قانونی اور فقہی مزاج پاتے ہیں جس کے مطابق دین پر عمل محض خشک قسم کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلام کے نفاذ میں جو دل چسپی دکھائی دیتی ہے وہ اس پر عمل کرنے میں نظر نہیں آتی۔ نفاذ اسلام کی کاوشوں میں بھی قانون کا نفاذ، اطاعت، جبر، خوف اور تشدد کے عناصر ملتے ہیں، لیکن رحم دلی، ہم دردی، انسانی مسائل اور مشکلات کا ادراک اور اس کے حل کے لیے کوشش کرنے جیسے عناصر بحیثیتِ طبقہ خاصے کم پائے جاتے ہیں۔

مدارس میں پائی جانے والی دوسری دینی روایت ہندوستانی علاقوں سے پاکستان میں آئی ہے۔ ہندوستانی والدین عموماً سخت گیر نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ ہندوستانی (اور اب پاکستانی) اساتذہ بھی زیادہ سخت گیر نہیں پائے گئے۔ دین کا فقہی اور قانونی پہلو اگرچہ یہاں بھی غالب ہے، لیکن ان کی طرف سے مذہب پر عمل کے معاملے میں تشدد کا رویہ بھی کم ہے۔ صوفیانہ روایت کے تحت خدا کی رحمت اور محبت کا پرچار بھی نسبتاً زیادہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہاں آپ کو خدا سے محبت و تعلق کے نمونے بھی زیادہ ملتے ہیں۔

سماج میں ایک تیسری جہت خدا کے تصور کو ماں کے تصور سے اخذ کرنے کی ہے۔ اس کی بنیاد

ایک بے اصل روایت پر ہے جس میں ماں کی محبت کو ستر ماؤں کی محبت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ تاہم، بخاری شریف کی ایک صحیح الاسناد روایت میں بیان ہوا ہے کہ ایک عورت، جس کا بچہ گم ہو گیا تھا، اپنی بے تابی میں اسے ایک بچہ مل، وہ اسے سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ اسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے یوں تبصرہ فرمایا: ''تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ جب تک اس کو قدرت ہو گی یہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ رحم کرنے والا ہے، جتنا یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہو سکتی ہے۔''

اس ارشاد میں مقصود خدا کی رحمت کو ماں کی رحمت سے زیادہ بتانا تھا، نہ کہ خدا کو ماں جیسا جذباتی اور سادہ مزاج بتانا۔ دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا رحیم ہے مگر جذباتی نہیں۔ وہ عدل کے خلاف نہیں کرتا۔ یہ اس کے اصول اور شان کے خلاف ہے۔ مگر ان روایات کے بل پر خدا کی رحمت سے متعلق جو مبالغہ آمیزی پیدا کی گئی، اس نے خدا کے ساتھ دلی محبت کا احساس تو پیدا کیا، مگر خدا کو ایک ماں جیسا جذباتی اور سادہ مزاج بنا کر بھی پیش کر دیا، جس سے جذباتی اپیل کے ذریعے سے عدل و انصاف کے تقاضوں کے برخلاف اپنے گناہوں اور جرائم کی معافی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس تصور نے دین پر عمل سے بے نیازی کی جرأت اور جواز پیدا کیا، تقویٰ کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔ ایسے تصورات قرآن مجید میں خدا کے تعارف سے بالکل مختلف، بلکہ متضاد ہیں۔ قرآن مجید خدا کا محفوظ کلام ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے تمام خارجی تاثرات سے خالی الذہن ہو کر خدا کا وہ تعارف حاصل کرے جو اس نے قرآن مجید میں اپنے بارے میں خود بتایا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق، خدا سخت گیر باپ کی طرح ہے نہ تشدد پسند استاد کی طرح، اور نہ ہی وہ ماں جیسی جذباتی طبیعت رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کا رب، ان کا معبود اور ان کا بادشاہ ہے۔ وہ رحمٰن و رحیم ہے، اور اسی لیے عادل ہے۔ عدل اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ وہ اگر عدل نہ کرے تو ظالموں پر اس کی رحمت مظلوم کے حق میں ظلم اور ناانصافی بن جائے، جب کہ خدا ہر ظلم سے بری ہے۔ اس کی رحمت اس کے عدل کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ خطا میں معقول عذر قبول کرتا ہے، مگر سرکشی

کو معاف نہیں کرتا۔ اس نے حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے سرکشوں کے لیے ابدی جہنم کی سزا سنائی ہے۔ ان میں کافر و مشرک کے علاوہ قاتل بھی شامل ہے۔ یہ اس لیے کہ بے دلیل شرک پر اصرار ہو یا اپنے ضمیر کے خلاف کسی کے ناحق قتل کا جرم یا خدا کے قائم کردہ دیگر حدود سے جان بوجھ کر تجاوز، یہ سب سرکشی کے جرائم ہیں۔ اس لیے ان سب کی سزا بھی ایک ہے۔

ضروری ہے کہ بچپن اور ماحول سے ملے ہوئے تصور خدا کی درستی قرآن مجید کی روشنی میں کی جائے۔ اس کے لیے قرآن مجید کا شعوری مطالعہ ضروری ہے۔

محمد ذکوان ندوی

ایمان کا ذائقہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ”تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور اونچی اونچی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنائے۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوسے اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہے۔ اُس کے پیٹ سے ایک مشروب نکلتا ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے (اضافۂ ایمان و ہدایت کی) عظیم نشانی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“ (النحل 16:68-69)

قرآن کی اس آیت سے متعلق استاذِ محترم مولانا وحید الدین خاں تحریر فرماتے ہیں:

”شہد کی مکھی کی زندگی میں ایسی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو اس حقیقت کو بتاتی ہیں کہ شہد کی مکھی کو یقینی طور پر خارج سے وحی جیسی رہنمائی دی جارہی ہے، خارجی رہنمائی کے بغیر شہد کی مکھی خود سے ایسا نہیں کر سکتی۔ شہد کی مکھی جس طرح کام کرتی ہے، اُس میں اِس نوعیت کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا چھتا۔ شہد کی مکھی اپنا ہر چھتا انتہائی صحت کے ساتھ اعلیٰ ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے بناتی ہے۔ اُس کو یہ ریاضیاتی علم کس نے دیا؟

شہد کے ایک چھتے میں ہزاروں مکھیاں کام کرتی ہیں۔ اُن کا یہ کام اتنے زیادہ منظم انداز میں ہوتا ہے جس کی مثال کسی بھی انسانی کارخانے میں موجود نہیں۔ شہد کی مکھیوں کو یہ ڈسپلن کس نے سکھایا؟ یہ مکھیاں جب پھولوں کا رس لا کر اپنے چھتے میں جمع کرتی ہیں تو اِسی کے ساتھ وہ

انتہائی مناسب مقدار میں اُس کے اندر ایک ایسا تحفظاتی مادہ (preservative) شامل کرتی ہیں جو شہد کو لمبی مدت تک خراب ہونے سے بچانے والا ہے۔ یہ فن شہد کی مکھی کو کس نے سکھایا؟

شہد کی مکھی شہد لانے کے لیے اکثر اپنے چھتے سے کئی کلو میٹر دور تک جاتی ہے۔ صبح کو جب وہ شہد لانے کے لیے اپنے چھتے سے روانہ ہوتی ہے تو وہ کس قدر اندھیرے میں روانہ ہوتی ہے، لیکن شام کو جب وہ شہد لے کر اپنی آخری ٹرپ سے لوٹتی ہے تو وہ کسی قدر اجالے میں لوٹتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ صبح کو اُس کا سفر اندھیرے سے اجالے کی طرف ہوتا ہے، لیکن شام کو اجالے سے اندھیرے کی طرف۔ اِس لیے صبح کو اگر وہ اندھیرے میں روانہ ہو تو اسے اطمینان ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر میں اجالا ہو جائے گا اور راستے صاف دکھائی دینے لگیں گے۔ اس کے برعکس، اگر وہ شام کو دیر سے واپس ہو تو اندیشہ ہے کہ جلد ہی اندھیرا ہو جائے اور وہ اپنے راستے سے بھٹک جائے۔ صبح کے پہلے سفر اور شام کے آخری سفر میں فرق کرنے کا یہ شعور اُسے کس نے دیا؟" (مطالعۂ قرآن 101-102)

شہد کی تخلیق کے اس عجیب معاملے پر غور کرتے ہوئے یہ نکتۂ معرفت واضح ہوتا ہے کہ جس طرح شہد کے اندر مادی مٹھاس پائی جاتی ہے، اِسی طرح اگر ایک شخص شہد اور اِس جیسی بے شمار تخلیقاتِ خداوندی پر غور کرے، تو اِس غور و فکر کے نتیجے میں اُس کو وہ نادر 'رزق رب' (طٰہٰ 20: 131) ملے گا، جسے ایک قولِ رسول میں 'ایمانی حلاوت' (طعم الایمان) کہا گیا ہے، یعنی فکری اور روحانی سطح پر ایمان باللہ کا وجدانی تجربہ، اور رسمی ایمان کے بجاے زندہ اور شعوری ایمان کا لطیف ترین ذائقہ۔

[بنگلور، 23/ جون 2023ء]

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

عمار خان ناصر

سیاست واقتدار اور اہل بیت کرام کا اسوہ

تاریخ کی تعبیر یک رنگ اور متفقہ نہیں ہو سکتی، اس میں ہمیشہ اختلاف کی گنجایش ہوتی ہے، خصوصاً جب تنازعات تاریخ کا حصہ بن چکے ہوں۔ تاہم تاریخ کے ایک ایسے فہم کی ضرورت ہوتی ہے جس سے تہذیب کا سفر ماضی کی تاریخی بحثوں میں الجھ کر نہ رہ جائے، بلکہ اس سے کچھ سبق سیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذریت اسماعیل کو دیے گئے سیاسی اقتدار کی قیادت کے لیے قریش کی امتیازی حیثیت تو بیان فرمائی تھی، لیکن اپنے خاندان یعنی بنو ہاشم کی کوئی خصوصی حیثیت بیان نہیں فرمائی۔ آپ کے قرب وفات کے زمانے میں سیدنا عباس اور سیدنا علی کے مابین اس پر گفتگو ہوئی کہ کیا ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ضمن میں کوئی تصریح کروا لینی چاہیے یا نہیں کہ اس معاملے میں اہل بیت کا کردار کیا ہو گا؟ لیکن یہی طے ہوا کہ اس معاملے کا مبہم رہنا ہی بہتر ہے اور حالات کو خود ہی اپنا ایک رخ بنانے دینا چاہیے۔

صحابہ میں سے بعض، مثلاً سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اقتدار حضور کے خاندان کے لیے ہی مخصوص ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ امت ان کو نظر انداز کر کے ایک طرح سے ان کی ناقدری کر رہی ہے۔ لیکن قریش کا عمومی رجحان، جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بتایا، یہ تھا کہ اقتدار اگر قریش میں رہنا ہے تو

پھر بنو ہاشم میں خلافت کو نہیں جانا چاہیے، کیونکہ نبوت اور خلافت، دونوں کے ایک خاندان میں جمع ہو جانے سے سیادت غیر معمولی طور پر ایک ہی جگہ مرتکز ہو جائے گی۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اس صورت حال کو اہل بیت کرام نے کیسے دیکھا اور اپنے لیے کیا لائحہ عمل متعین کیا۔ اسی اسوے میں ہمارے لیے رہنمائی ہے اور اسی پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے فہم کے مطابق سیاسی اقتدار کے باب میں اہل بیت کرام کے مجموعی اسوے کو درج ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جا سکتا ہے:

1۔ اگر امت کی سیاسی عصبیت کی تائید حاصل نہ ہو تو سیادت کی کشمکش میں فریق نہ بنا جائے، بلکہ اولو الامر کی خیر خواہی اور معاونت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور حسب موقع وضرورت مشورہ یا تنقید کی صورت میں امور کی انجام دہی میں ان کی مدد کی جائے۔ یہ اسوہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خلفاے ثلاثہ کے عہد میں پیش فرمایا۔

2۔ سیاسی حالات بگاڑ اور انتشار کا شکار ہوں اور زمام کار کو سنبھالنے کا تقاضا کر رہے ہوں تو کنارہ کشی اختیار نہ کی جائے، بلکہ اپنی بساط اور فہم کے مطابق مسلمانوں کی سیاسی قوت کو دوبارہ مجتمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ اسوہ سیدنا علی نے اپنے عہد خلافت میں پیش کیا، اگرچہ اس میں انھیں چند در چند مشکلات درپیش رہیں اور ان کی حکمت عملی پر کچھ سوالات بھی اٹھائے جا سکتے ہیں۔

3۔ سیاسی عصبیت کے میدان میں پلڑا دوسری جانب جھک چکا ہو اور قتل و قتال کا سلسلہ موقوف ہو جانے کے بعد از سر نو بیدار ہونے کے لیے آمادہ ہو تو مسلمانوں کی وحدت اور اجتماع کو ترجیح دی جائے اور باوقار شرائط کے ساتھ صلح کا امکان موجود ہو تو اسے اختیار کر کے اقتدار سے دستبرداری قبول کر لی جائے۔ یہ اسوہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے پیش فرمایا۔

4۔ اگر کسی مخصوص علاقے میں، محدود سطح کی ہی سہی، سیاسی عصبیت میسر ہو اور علیٰ منہاج النبوۃ، سیاست واقتدار کا نمونہ دوبارہ قائم کرنے کے امکانات بظاہر دکھائی دے رہے ہوں تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ یہ اسوہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کی طرف سے دعوت موصول ہونے پر اختیار کیا۔

5۔ اگر سیاسی عصبیت کا مضمحل ہونا واضح ہو جائے تو بے فائدہ ٹکراؤ کے راستے پر بڑھتے چلے

جانے کے بجاے مصالحت کے امکان پر دوبارہ غور کیا جائے، لیکن اس کا طریقہ اور شرائط باوقار ہونے کو بھی اہم سمجھا جائے۔ اگر باوقار صلح کا آپشن نہ ہو تو جان کی قربانی پیش کر دی جائے۔ یہ اسوہ سیدنا حسین اور ان کے اہل خانہ نے کربلا میں پیش کیا۔

6۔ سیاسی عصبیت کے امکانات محدود تر ہو جائیں اور ایسی کسی بھی کوشش کا، امت کے افتراق کو بڑھانے پر منتج ہو جانا یقینی ہو تو سیاسی کشمکش سے مکمل طور پر گریز کر کے علم، تقویٰ اور حسن کردار کے میدان میں امت کی رہنمائی تک خود کو محدود کر لیا جائے اور ارباب اقتدار کے باب میں کلمۂ حق کہنے کی سنت کو زندہ رکھا جائے۔ یہ اسوہ واقعۂ کربلا کے بعد ائمہ اہل بیت نے عموماً اختیار فرمایا۔

اس بحث کو ایک بڑے تہذیبی سوال سے جڑے ہوئے مختلف امکانات کے تناظر میں دیکھا جائے اور اس پہلو پر نظر رکھی جائے کہ اہل بیت کرام نے مختلف احوال میں ہمارے لیے کیا اسوہ چھوڑا ہے تو یہی بحث فرقہ وارانہ انداز کی بحث وجدال سے اٹھ کر ہمارے لیے ایک بڑی تہذیبی رہنمائی کا ماخذ بن سکتی ہے۔

ہذا ما عندی واللہ تعالیٰ اعلم

مشفق سلطان

ہندو مذہبی صحائف میں محمد ﷺ کی پیش گوئیاں ایک تنقیدی جائزہ

مسلمانوں میں اس بات کی بڑی شہرت ہو گئی ہے کہ ہندو مذہبی کتابوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے متعلق واضح پیش گوئیاں موجود ہیں۔ ایک زمانے میں میرا بھی یہی خیال تھا اور اس کو بڑے زور کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان بھی کرتا رہا۔ تاہم بعد میں جب براہ راست ہندو صحائف کے مطالعے کا موقع ملا اور ان پیش گوئیوں کے بارے میں ہمارے مبلغین کی تاویلات کو دقت نظر کے ساتھ پرکھا تو اپنی سابقہ رائے کو تبدیل کر لیا۔ پچھلے سالوں میں کئی بار اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہندو مذہبی متون کو اپروچ کرنے کا جو نہج بعض مسلم مبلغین نے اختیار کیا ہے وہ انتہائی سطحی اور ناقص ہے۔ ان شخصیات سے والہانہ عقیدت کی بنا پر مسلمانوں نے بلا تحقیق ان کی باتوں کو اختیار کر لیا اور ہندو عوام سے مکالمے (بلکہ مناظرے) کے لیے اکثر لوگ انھی باتوں کو استعمال کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں تحقیقی ذوق پہلے ہی مفقود ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ جب کوئی مسلمان سنسکرت کتابوں کے حوالے دے کر، کچھ منتروں کو (اکثر غلط تلفظ کے ساتھ) دہرا کر اسلام کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو داد تحسین ضرور حاصل ہوتی ہے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ میں اس بارے میں کوئی مضمون لکھوں، لیکن اپنی مصروفیت اور صحت کے بعض مسائل کی وجہ سے نہیں لکھ سکا۔ اپنی آئندہ تحریروں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان مزعومہ پیشن گوئیوں پر میں اپنا تجزیہ پیش

کروں گا۔ سب سے پہلے 'کَلکی اوتار' کی پیشن گوئی کو دیکھتے ہیں جس کا مصداق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

'کَلکی اوتار' کی پیشن گوئی 'پُران' (Purana) نامی کتب میں موجود ہے۔ ہندو مذہبی کتب میں ان کی استنادی حیثیت اتنی مضبوط نہیں ہے۔ تاہم عوام الناس میں یہی کتابیں زیادہ مقبول ہیں۔ کَلکی اوتار سے متعلق پیشن گوئی بنیادی طور پر 'بھاگوت پران' اور خاص اسی موضوع پر اسی نام سے موسوم 'کَلکی پران' میں موجود ہے۔ انھی دو کتابوں کو سامنے رکھ کر ہم اس پیشن گوئی کا تجزیہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ کیا فی الواقع ان میں مذکور تفصیلات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے مطابقت رکھتی ہیں، جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے، یا نہیں۔

کَلکی اوتار کے والدین

तत् श्रुत्वा पुण्डरीकाक्षो ब्रह्मानमिदमब्रवीत्
शम्भले विष्णुयशसो गृहे प्रादुर्भावाम्यहम्
सुमत्यां मातरि विभो! पत्नीयां तवन्निदेशतः

"پنڑری کاکش وِشنو بھگوان برہما جی کی ان باتوں کو سن کر برہما جی سے کہنے لگے کہ میں تمھارے کہنے سے 'شَمبھل' نامی گاؤں میں 'وِشنویَش' نام والے براہمن کے گھر 'سُمَتی' نامی براہمن کی بیٹی کے حمل سے پیدا ہوؤں گا۔" (کلکی پران۔ ادھیاے 2، اشلوک 4)

"تب وشنویش سے سُمَتی حاملہ ہوئی، اس طرح کہ ان کے رحم میں وشنو بھگوان ودیمان ہوئے۔" (ایضاً، اشلوک 11)

اس اشلوک میں وشنو کے اوتار کلکی کے والد کا نام 'وِشنویَش' (Vishnu Yash) اور والدہ کا نام 'سُمَتی' (Sumati) بتایا گیا ہے۔

ان ناموں کے بارے میں ہمارے مبلغین فرماتے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے اسما کے سنسکرت بدل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کلکی اوتار کے والد کا نام 'وِشنویش' (विष्णुयश) آیا ہے جس کے معنی 'اللہ کے بندے' کے ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک وِشنو سے مراد اللہ ہے اور یَش کے معنی بندے کے ہیں۔ لیکن حقیقت میں سنسکرت زبان کے لفظ 'یش' کا مطلب 'بندہ' نہیں

ہے، بلکہ اس لفظ کے معنی 'جلال' یا 'عظمت' کے ہیں۔ تو 'وشنو یش' کے معنی ہوں گے 'وشنو کا جلال' یا 'وشنو کی عظمت'۔ کسی شخص کا اگر یہ نام ہو تو اس کا مطلب ہو گا وہ جس کے اندر وشنو کا جلال یا عظمت ظاہر ہو۔ اس کا عربی مترادف 'عبد اللہ' نہیں، بلکہ 'جلال اللہ' یا 'بہا اللہ' ہو گا۔

اسی طرح کلکی اوتار کی والدہ کا نام 'سُمتی' (सुमति) بتایا گیا ہے۔ اس پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس نام کے معنی 'امانت دار' یا 'امن والی' کے ہیں اور عربی میں اسے 'آمنہ' کہیں گے۔ یہ معنی بھی محل نظر ہیں۔ سنسکرت لغت میں 'متی' (मति) کے معنی 'عقل'، 'فہم' یا 'علم' کے آتے ہیں۔ 'سُ' (सु) ایک سابقہ (उपसर्ग) ہے جو کسی صفت سے قبل آنے پر ایک چیز کو مثبت انداز میں اس صفت سے متصف بناتا ہے۔ تو لفظ 'سُمتی' کے معنی ہوتے ہیں 'علم والی'، 'فہم والی' یا 'عقل والی'۔ 'امن والی' یا 'امانت دار' اس کے معنی نہ جانے کس لغت میں ہیں۔ اس کے عربی مترادفات 'علیمہ'، 'عقیلہ' وغیرہ جیسے الفاظ ہیں۔

لہٰذا کلکی اوتار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ناموں میں مطابقت موجود نہیں ہے، بلکہ خواہ مخواہ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلکی کا مقام پیدایش

کلکی پران کے اسی اشلوک میں کلکی کا مقام پیدایش 'شَمبھل' (शम्भल/Shambhal) بتایا گیا ہے۔

ہمارے یہ حضرات لکھتے ہیں کہ یہ نام لفظ 'شَم' (शम्) سے بنا ہے جس کے معنی 'امن' کے ہوتے ہیں۔ اور لفظ 'شمبھل' ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگوں کو امن حاصل ہو۔ اس کے بعد وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کو قرآن مجید میں 'بلد امین' کہا گیا ہے اور سورۂ آل عمران کی آیت 97 میں اسی کے بارے میں 'وَ مَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا' آیا ہے۔ اس لیے ان حضرات کے نزدیک 'شمبھل' سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس نام کا کوئی مقام ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جو ہندوستان کے جغرافیے سے کسی قدر واقف ہے جانتا ہے کہ یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔ 'شمبھل' نام کا مقام ہندوستان کی ریاست اُتر پردیش میں دریاے گنگا کے نزدیک واقع ہے۔ اس مقام کے ہوتے ہوئے لفظ 'شمبھل' کو اسم کے بجاے صفت قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ زبان کے قواعد

کی رو سے اسے درست تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو ہر کسی کتاب میں موجود اسما کو صفات قرار دے کر ان کا کچھ سے کچھ مطلب لیا جاسکتا ہے۔

کلکی کی تاریخِ پیدایش

द्वादश्या शुक्लपक्षस्य माधवे मासि माधव
जात ददृशतु पुत्र पितरौ हृष्टमानसौ

''بیساکھ مہینے کے پہلے نصف حصے میں بارہویں کے دن بھگوان پیدا ہوئے۔ ان کو پیدا ہوتے دیکھ ان کے والدین کو انتہائی مسرت ہوئی۔'' (ایضاً، اشلوک 15)

کلکی پران کے اس اشلوک میں کلکی کی تاریخ پیدایش بیساکھ مہینے کی بارہویں بتائی گئی ہے۔ اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ یہ وہی تاریخ ہے جو ہمارے قمری حساب سے بارہ ربیع الاول بنتی ہے، جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدایش کے طور پر مشہور ہے۔ لیکن اس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل فراہم نہیں کی جاتی جس سے یہ دکھایا جاسکے کہ 571 عیسوی کے 12 ربیع الاول کی مطابقت بیساکھ کی 12 تاریخ سے ہوتی ہو۔

کلکی کی پیدایش اور ابتدائی زندگی سے متعلق چند تفصیلات

'کلکی پران' میں مذکور کلکی سے متعلق بعض تفصیلات ایسی ہیں جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی زندگی سے بالکل بھی مطابقت نہیں رکھتیں۔

ا۔ وشنویش براہمن نے کلکی روپ بھگوان کی ترقی اور بہتری کی غرض سے صاف دل ہو کر بڑے بڑے رگویدی، یجرویدی اور سام ویدی براہمنوں سے ان کا نام کرن کرایا۔

(ادھیائے 2، اشلوک 23)

ب۔ کلکی بھگوان سے پہلے ان سے بڑے اور تین بھائی پیدا ہوئے تھے۔ ان تینوں کے نام کَوی، پراگیہ اور سُمنترک تھے۔ (ایضاً، اشلوک 31)

ج۔ کلکی کے والد وشنویش کلکی کا اُپ نَین سنسکار کر کے ان کو ویدوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گروکل بھیجتے ہیں۔ (ایضاً، اشلوک 49)

د۔ کلکی گروکل میں پرشُرام جی سے روایتی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور چونسٹھ فنون سمیت

سانگ اُوپانگ وید اور دھنور وید وغیرہ پڑھتے ہیں۔(ادھیائے 3، اشلوک 6)

ان حوالہ جات سے درج ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

1۔ کلکی کی پیدایش کے وقت ان کے والد زندہ ہوں گے اور ان کا نام خود رکھوائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہے کی ان کی پیدایش کے وقت ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

2۔ کلکی کی پیدایش سے قبل ان کے تین بھائیوں کی ولادت ہو چکی ہو گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات درست نہیں ہے۔

3۔ کلکی کے والد ہندو دھرم کے مطابق اپنے بیٹے کا اپ نین سنسکار کریں گے اور ویدوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ گروکل میں رہنے کے لیے بھیجیں گے جہاں وہ روایتی تعلیم حاصل کریں گے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، نہ کسی مدرسے میں داخلہ لیا۔

یہ سب تفصیلات بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

کلکی اوتار کی ازدواجی زندگی

'کلکی پران' میں ہے کہ کلکی کا بیاہ سِنگھل دیش کے راجا کی بیٹی پدما سے ہو گا۔

(ادھیائے 2، اشلوک 6)

'کلکی پران' میں کلکی کی صرف ایک زوجہ کا ذکر ہے۔ صاف ہے کہ کلکی کی ایک ہی زوجہ ہوں گی اور وہ بھی ان کے اپنے وطن کی نہیں، بلکہ سنگھل دیش یعنی سری لنکا کی رہنے والی ہوں گی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہے کہ آپ کی گیارہ ازواج مطہرات تھیں اور سنگھل دیش سے کسی کا بھی تعلق نہیں تھا۔

کلکی اوتار کی صفات

کلکی اوتار کی بعض دوسری صفات اور ان کے ذاتی حالات جو 'کلکی پران' میں مذکور ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ تنہا ان کی بنیاد پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پیشن گوئی کا مصداق قرار دیا جا سکے۔ مثلاً یہ

کہ کلکی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر، ہاتھ میں تلوار لیے تیز رفتاری سے پوری زمین کا سفر کریں گے اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے برے لوگوں کا قتل عام کریں گے جو مختلف مقامات پر حکومت کر رہے ہوں گے (بھاگوت پران حصہ 12، ادھیائے 2، اشلوک 19)۔ اس سے لوگ بہ ظاہر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو جنگوں میں شریک ہوئے اور اپنے دشمنوں کا قتل کیا۔ اس لیے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کلکی اوتار ہیں۔ اول تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام روے زمین کا سفر ایک گھوڑے پر نہیں کیا اور نہ یہ ایسی کوئی بات ہے جو کسی دوسرے حکمران یا فاتح پر صادق نہ آسکے۔ اب رہیں کلکی اوتار کی بعض خوبیاں اور حکمت، تواضع، شجاعت وغیرہ جیسے اوصاف، تو یہ کسی پر بھی منطبق کیے جاسکتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر قطعاً کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔

خلاصۂ کلام

اس تجزیے کی رو سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلکی اوتار کی پیشن گوئی کا مصدق قرار دینا محض تکلف ہے۔ اس کے لیے کلکی کے بعض ذاتی احوال کو یکسر صرف نظر کیا جاتا ہے اور سنسکرت الفاظ اور عبارات کے غلط معنی بیان کیے جاتے ہیں۔

اس طرح ہندو مذہبی صحائف کی من مانی تشریح سے دین اسلام کی خدمت کے بجاے ہماری دعوت کو نقصان پہنچتا ہے۔ دین کی دعوت ہر حال میں محکم بنیادوں پر استوار رہنی چاہیے۔

سید منظور الحسن

تصنیف و تالیف اور نشرو اشاعت کی مجوزہ حکمت عملی

—برائے المورد و رفقاے المورد—

[زیرِ نظر تحریر "المورد" کے اہتمام میں ہونے والے تصنیفی کاموں کا مجوزہ پالیسی بیان ہے۔ یہ راقم کا موقف ہے اور اِسے بعض احباب کے استفسار پر لکھا گیا ہے۔ یہ موقف اُس فہم پر مبنی ہے، جو راقم نے گذشتہ 30 برسوں کے دوران میں استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے فکر و عمل سے اخذ کیا ہے۔ اِسے پیش کرنے کا مقصد اُس ابہام اور خلطِ مبحث کو دور کرنے کی کوشش ہے، جو گذشتہ دس پندرہ سالوں سے اہل المورد محسوس کر رہے ہیں اور اِس کے ساتھ اُس ہلاکت خیز غلطی سے متنبہ کرنے کی جدوجہد ہے، جس میں "المورد" کے مختلف مراکز کے اہل انتظام بہت حد تک مبتلا ہو چکے ہیں۔ ڈر ہے کہ اگر اِس کی جلد اصلاح نہ کی گئی تو "المورد" جیسے عظیم الشان دعوتی ادارے کو کتابوں کی اشاعت کے ادارے میں تبدیل ہونے سے نہیں روکا جا سکے گا۔ مصنف]

مقصد

ادارۂ علم و تحقیق المورد کے زیر اہتمام تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے کاموں کا بنیادی مقصد انبیا علیہم السلام کے طریقے پر دعوت و انذار کا احیا ہے۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ دین پر غور و

فکر کے عمل کو صحیح نہج پر قائم کیا جائے اور دین کی دعوت کو فرقہ دارانہ تعصبات سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنا پر پیش کیا جائے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے ایسی تصانیف کا سامنے آنا ضروری ہے، جن میں:

1۔ قرآن و سنت کو اساس کی حیثیت حاصل ہو،

2۔ دین کی شرح و وضاحت کسی آمیزش کے بغیر اور بے کم و کاست کی گئی ہو،

3۔ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں تزکیہ و تطہیر اور اخلاق و ادب کی تعلیم دی گئی ہو،

4۔ علم جدید کے اُس چیلنج کا جواب دیا گیا ہو، جو اِس وقت امت مسلمہ کو درپیش ہے،

5۔ فکر اسلامی کے مختلف علوم و فنون کی تحقیق و تنقیح کی گئی ہو،

6۔ زمانۂ رسالت سے دورِ حاضر تک مسلمانوں کے فکر و عمل کا جائزہ لیا گیا ہو،

7۔ رائج افکار پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہو۔

بنیادی اصول

''المورد'' کا تصنیفی کام جس اصول پر قائم ہے، وہ یہ ہے کہ دین کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری علماے دین پر عائد ہے۔ وہ اِس بات کے مکلف ہیں کہ پوری جستجو اور جاں فشانی سے دین کے علم کو حاصل کریں اور پھر کامل عزم و ہمت کے ساتھ اُسے لوگوں تک پہنچائیں۔ عام مسلمان اِس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اُن سے دین کا تقاضا ہے کہ وہ علما کے کاموں کے انتظام و انصرام اور اُن کی نشر و اشاعت کے لیے اپنا تعاون بہم پہنچائیں اور دامے درمے قدمے سخنے دین کے فروغ اور تجدید و احیا کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔ یہ خدمات اُنھیں خالص نصرتِ دین کے جذبے سے اور عند اللہ اپنا اجر محفوظ کرنے کے لیے پیش کرنی چاہییں۔

''المورد'' کا کردار

درج بالا مقصد اور بنیادی اصول کی بنا پر ''المورد'' کے کردار کے ایجابی اور سلبی پہلو درج ذیل ہیں:

اولاً، ''المورد'' کے تینوں عناصر ترکیبی ـــــ علما، منتظمین اور مخاطبین ـــــ للہ فی اللہ ادارے سے متعلق ہوتے ہیں۔ علما اِس لیے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور اپنی معذرت پیش کر سکیں،

اصحاب ثروت اور اہل عمل اِس لیے مدد کرتے ہیں کہ اللہ کی خوش نودی کو پا سکیں اور عوام الناس اِس لیے متوجہ ہوتے ہیں کہ دین کو سمجھ کر اُس پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اگر تمام عناصر ترکیبی کی وابستگی کا مقصد رضاے الٰہی ہے تو لازم ہے کہ ادارے کے تمام افعال و احوال کا اصل ہدف آخرت ہونا چاہیے۔

ثانیاً، ''المورد'' کا انتظامی ڈھانچا ــــ جو عام مسلمانوں پر مشتمل ہے ــــ دین کی شرح و وضاحت اور دعوت و تبلیغ کا مکلف نہیں ہے۔ اُس کی ذمہ داری علما کو اُن کے کام میں مدد فراہم کرنا ہے۔ یہ مدد وہ کسی کاروباری ترقی یا کسی مالی منفعت کے لیے نہیں، بلکہ اخروی اجر و ثواب کی غرض سے انجام دیتا ہے۔ چنانچہ ''المورد'' کے اہداف اور اُس کی تنظیم و ترتیب کے معیارات کئی پہلوؤں سے عام کاروباری اداروں سے مختلف ہیں۔

ثالثاً، نجی شعبے میں تعلیم و تعلم (education) اور نشر و اشاعت (media) کے ادارے، بالعموم کاروباری مقاصد کے لیے قائم ہوتے ہیں۔ اُن میں کچھ سرمایہ کار منافع کمانے کے لیے سرمایہ لگاتے ہیں۔ معلمین، مصنفین اور مقررین وغیرہ کو اِسی مقصد کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے۔ اُن کا مقصد بھی محض ملازمانہ فرائض انجام دینا ہوتا ہے۔ اِن میں عوام کی فلاح و بہبود بھی اصلاً پیش نظر نہیں ہوتی۔ ''المورد'' کو ایسے کاروباری اداروں پر ہرگز قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اِس کا نتیجہ ادارے کی شکست و ریخت کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔

رابعاً، ''المورد'' کو اِس لیے بھی کاروباری اشاعتی اداروں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کہ اِس میں کسی سرمایہ کار نے سرمایہ کاری نہیں کی۔ اِس کے مالیات کا انحصار لوگوں کی اعانتوں پر ہے، جو وہ نصرتِ دین اور خدمتِ خلق کے جذبے سے پیش کرتے ہیں۔ اِس کے معلمین، مصنفین اور مقررین ملازمت کی غرض سے نہیں، بلکہ خدمتِ دین کے لیے وابستہ ہوئے ہیں۔ اِس کے منتظمین کی بھی اِس سے کوئی کاروباری یا مالی منفعتیں وابستہ نہیں ہیں۔

خامساً، علم و تحقیق، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ ''المورد'' کے علما کا کام ہے۔ وہی اِس کام کی نوعیت کو واضح کر سکتے، اِس کی حقیقت کو سمجھا سکتے، اِس کے پیش و عقب کو جان سکتے، اِس کے عیب و صواب کو پرکھ سکتے اور اِس کے نتائج و اثرات کا مواجہہ کر سکتے ہیں۔ اِس امر کا فطری تقاضا ہے کہ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی حکمتِ عملی کی ترتیب و تشکیل اور اطلاق و انطباق میں

کلیدی حیثیت علما کی آرا کو حاصل ہونی چاہیے۔

حکمتِ عملی

درجِ بالا مقدمات کی روشنی میں ''المورد'' کی تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی حکمتِ عملی کے خط و خال درجِ ذیل ہیں:

1۔ تصنیف کے تمام علمی امور ــــ فکر، بیان، معلومات، مشمولات اور پریزنٹیشن ــــ کی اصل ذمہ داری مصنف پر عائد ہو گی۔ چنانچہ تصنیف کے جملہ علمی امور کے حقوق و اختیارات (rights) مصنف کے پاس ہوں گے۔

2۔ تصنیف کے تمام عملی امور ــــ پرنٹنگ، پبلشنگ اور مارکیٹنگ ــــ کی اصل ذمہ داری ادارے پر عائد ہو گی۔ چنانچہ تصنیف کے جملہ عملی امور کے حقوق و اختیارات (rights) ادارے کے پاس ہوں گے۔

3۔ مصنف اور ادارہ ایک دوسرے کے امور میں اپنی تجاویز اور مشورے پیش کر سکیں گے۔

4۔ تصنیف کی ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ، فارمیٹنگ اور ڈیزائننگ کے تمام کام ادارے کی ذمہ داری ہوں گے، تاہم اِن میں ترجیح و اختیار کی فیصلہ کن حیثیت مصنف کو حاصل ہو گی۔

5۔ کتاب کا ٹائیٹل مصنف اور پبلشر کے باہمی اتفاق سے طے ہو گا۔ اختلاف کی صورت میں مصنف کی رائے حتمی ہو گی۔

6۔ تصنیف کی ساخت (ای بک، ہارڈ باؤنڈ، پیپر بیک)، قیمت، تقسیم، ترسیل، تشہیر کے کاموں کی ذمہ داری اور اختیارات ادارے کے پاس ہوں گے۔ مصنف کو اِن میں مداخلت کا حق نہیں ہو گا۔

7۔ اگر کوئی تصنیف کسی صاحبِ علم کی تحریر و تقریر سے اخذ و استفادے پر مبنی ہے تو اولاً اُس سے اشاعت کی اجازت حاصل کی جائے گی اور ثانیاً اُسے رائلٹی میں شریک کیا جائے گا۔

(شرح و وضاحت کی کتابوں پر اِس اصول کا اطلاق نہیں ہو گا)

8۔ اگر ادارہ اپنے نظم سے وابستہ یا غیر وابستہ مصنف کی کتاب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرا کے اُسے شائع کرنا چاہے گا تو اولاً مصنف سے اجازت حاصل کرنا ہو گی اور ثانیاً اُسے رائلٹی میں شریک کیا جائے گا۔

9۔ اگر ادارہ اپنے نظم سے وابستہ یا غیر وابستہ مصنف کی کتاب کو آڈیو / ویڈیو بک میں پیش کرنا چاہے گا تو اولاً مصنف سے اجازت حاصل کرنا ہو گی اور ثانیاً اُسے رائلٹی میں شریک کیا جائے گا۔

10۔ کتاب کی ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ، فارمیٹنگ اور ڈیزائننگ تصنیف و تالیف سے بالکل الگ کام تصور ہوں گے۔ چنانچہ مصنف سے یہ تقاضا نہیں کیا جائے گا کہ وہ کتاب کو قابلِ اشاعت (printable) صورت میں دستیاب کرے۔ یہ کام ادارہ بہ طور پبلشر انجام دے گا۔

11۔ بوقتِ ضرورت کسی مصنف کے تصنیفی کام کی جانچ پرکھ اور نظر ثانی کا کام دیگر مصنفین انجام دیں گے۔ انتظامی افراد کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔

فکر سے کتاب تک کے مراحل

1۔ فکر / مفکر (thinker)

فکر ایک نظریہ (thought) یا تصور ہے، جسے کوئی مفکر (thinker) پیش کرتا ہے۔

ہمارے مفکرین: حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، جاوید احمد غامدی۔

2۔ تحقیق / محقق (researcher)

کسی فکر یا نظریے کو ثابت کرنے کے لیے محقق مواد کی تحقیق کرتا ہے۔

ہمارے محققین: حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، جاوید احمد غامدی۔

3۔ تحقیقی معاونت / معاون محقق (research assistant)

محقق کی ضرورت اور ہدایت کے مطابق معاون محقق مواد کی تلاش اور چھان پھٹک کے لیے اُسے معاونت فراہم کرتا ہے۔

ہمارے معاون محققین: بعض موقعوں پر معز امجد، ڈاکٹر شہزاد سلیم، ڈاکٹر محمد عامر گزدر، محمد حسن الیاس اور بعض دوسرے اہل علم استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کو تحقیقی معاونت پیش کرتے رہے ہیں۔

4۔ تصنیف / مصنف (author/writer)

کسی فکر یا تحقیق کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے مصنف اُسے تحریر کرتا اور کتاب کا مسودہ تیار کرتا ہے۔

مفکر، محقق اور مصنف الگ الگ شخصیات بھی ہو سکتی ہیں اور ایک شخصیت بھی اِن تینوں کی جامع ہو سکتی ہے۔

ہمارے مصنفین 1: فراہی، اصلاحی، غامدی۔

(اِنھوں نے اپنے بیش تر افکار اور تحقیقات کو خود لکھا ہے)۔

ہمارے مصنفین 2: خالد مسعود، محمد رفیع مفتی، طالب محسن، معز امجد، نعیم احمد بلوچ، ساجد حمید، ڈاکٹر شہزاد سلیم، ریحان یوسفی، محمد ذکوان ندوی، عرفان شہزاد، رضوان اللہ، جنید حسن، محمد حسن الیاس، ڈاکٹر محمد عامر گزدر، سید منظور الحسن۔

(اِنھوں نے ہمارے مفکرین —— فراہی، اصلاحی اور غامدی —— کے افکار اور تحقیقات کو لکھا ہے)۔

5۔ ترجمہ / مترجم (translator)

مترجم تصنیف کو دوسری زبان میں تحریر کرتا ہے۔

ہمارے مترجمین: ہمارے ہاں یہ کام خالد مسعود، ڈاکٹر شہزاد سلیم اور بعض دیگر اہل علم نے انجام دیا ہے۔

6۔ ٹرانسکرائبنگ / ٹرانسکرائبر (transcriber)

ٹرانسکرائبر تقریر یا گفتگو کو تحریر میں منتقل کرتا ہے۔

ہمارے ٹرانسکرائبر: استاذ گرامی کے بعض انٹرویوز اور تقاریر کو شاہد محمود نے ٹرانسکرائب کیا ہے۔

7۔ کمپوزنگ / کمپوزر (composer)

کمپوزر مسودے کو کمپوز کرتا ہے تاکہ اُسے اشاعت کے لیے تیار کیا جا سکے۔

ہمارے کمپوزر: فاروق ضمیر اور بعض دوسرے افراد یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔

8۔ پروف ریڈنگ / پروف ریڈر (proof reader)

پروف ریڈر کمپوزڈ مسودے کو اصل مسودے کے مطابق کرتا اور کمپوزنگ کی غلطیاں درست کرتا ہے۔

ہمارے پروف ریڈر: یہ کام نعیم احمد اور بعض دوسرے افراد انجام دیتے رہے ہیں۔

9۔ ادارت / مدیر (editor)

مدیر تحریر کی زبان و بیان کو دیکھتا ہے، اُس میں اوقاف لگاتا ہے، سرخیاں نکالتا ہے، حوالوں کی پڑتال کرتا ہے، فہرست بندی کرتا ہے، تکرار یا اضافی چیزوں کو ختم کرتا ہے، کوئی خلا ہیں تو اُنھیں پر کرتا ہے۔

ہمارے مدیر: جناب جاوید احمد غامدی، علامہ خالد مسعود، ڈاکٹر منیر احمد، معز امجد، ڈاکٹر شہزاد سلیم، آصف افتخار، سید منظور الحسن، محمد بلال اور محمد ذکوان ندوی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

10۔ ادارت میں معاونت / معاون مدیر (assistant editor)

یہ مدیر کے درج بالا کاموں میں معاونت ہے۔

ہمارے معاون مدیران: معظم صفدر، شاہد محمود، طارق ہاشمی، شاہد رضا یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔

11۔ ڈیزائننگ / ڈیزائنر (designer)

ڈیزائنر کتاب کے ٹائیٹل، سب ٹائیٹل، بیک ٹائیٹل اور اندرونی صفحات کی فارمیٹنگ، پلیسمنٹ اور ایڈجسٹمنٹ کا کام کرتا ہے۔

ہمارے ڈیزائنر: یہ کام محمد مشتاق اور بعض دیگر افراد انجام دیتے رہے ہیں۔

12۔ پبلشنگ / پبلشر (publisher)

پبلشر مصنف کی تصانیف کو معاشرے تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ اِس ضمن میں وہ تین امور انجام دیتا ہے:

1۔ مسودے کے بعد سے پی ڈی ایف تک کی تیاری،

2۔ پرنٹنگ کا اہتمام،

3۔ ڈسٹری بیوشن کا اہتمام۔

ہمارے پبلشر: استاذِ گرامی کی کتابوں کے لیے یہ پوزیشن ''المورد'' پاکستان کو حاصل ہے۔

13۔ پرنٹنگ / پرنٹر (printer)

عموماً پبلشر کا اپنا پریس نہیں ہوتا۔ کتاب چھپوانے کے لیے وہ پرنٹر کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

ہمارے پرنٹر: ''المورد'' پاکستان کی کتابوں کے لیے یہ کام شرکت پرنٹنگ پریس، ٹوپیکل

پرنٹنگ پریس، فائن پرنٹرز اور بعض دوسرے پرنٹر انجام دیتے رہے ہیں۔

14۔ڈسٹری بیوشن / ڈسٹری بیوٹر (distributer)

مختلف آؤٹ لٹس تک کتابوں کو پہنچانے کا کام بعض اوقات پبلشر خود انجام دیتا ہے اور بعض اوقات اس کام کے لیے مخصوص کمپنیوں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

ہمارے ڈسٹری بیوٹر: یہ کام زیادہ تر ''المورد'' نے خود اور بعض موقعوں پر ''دارالتذکیر'' نے انجام دیا ہے۔

تصنیفی کام کی اقسام

1۔اصل اور حقیقی تصانیف (original & genuine writings)

اِن تصانیف میں فکر (thinking)، تحقیق (research) اور تصنیف (writing) کے کام ایک ہی شخصیت سے صادر ہوتے ہیں۔ ''المورد'' کی مطبوعات میں اِس کی مثال جناب جاوید احمد غامدی کی تصانیف ''البیان''، ''میزان''، ''برہان''، ''مقامات'' اور ''خیال و خامہ'' ہیں۔

2۔بیانیہ تصانیف (narration/description based writings)

اِن تصانیف میں ایک مصنف کسی مفکر کے علم و تحقیق کو اُس کی تقریروں اور تحریروں سے اخذ کر کے اپنے فہم (understanding) اور اسلوب (writing style) کے مطابق تحریر کرتا ہے۔

''المورد'' کی مطبوعات میں اِس کی مثال ''اسرا و معراج: غامدی صاحب کا موقف'' اور ''نزول مسیح: غامدی صاحب کا موقف'' ہیں۔ اِن میں جناب جاوید احمد غامدی کے افکار اور تحقیقات کو راقم (سید منظور الحسن) نے اپنے فہم کے مطابق اور اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

3۔شرح و وضاحت پر مبنی تصانیف (explanation & analysis based writings)

اِن تصانیف میں ایک مصنف کسی مفکر کے علم و تحقیق کی اپنے زاویۂ نظر سے توضیح و تحلیل کرتا ہے۔

''المورد'' کی مطبوعات میں اِس کی مثال ''میزان — توضیحی مطالعہ'' ہے۔ یہ ڈاکٹر عمار خان ناصر کی تصنیف ہے۔ اِس میں اُنھوں نے جناب جاوید احمد غامدی کی کتاب ''میزان'' کی شرح و

وضاحت کا کام کیا ہے۔

4۔ تراجم (translations)

اِن تصانیف میں ایک مصنف کسی دوسرے مصنف کی تصنیف کا مختلف زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔

''المورد'' کی مطبوعات میں اِس کی مثال ڈاکٹر شہزاد سلیم کی کتاب ''Islam — A Comprehensive Introduction'' ہے۔ یہ جناب جاوید احمد غامدی کی کتاب ''میزان'' کا انگریزی ترجمہ ہے۔

5۔ ملفوظات / خطبات نگاری / مکالمہ نگاری

اِن تصانیف میں کسی مفکر کی گفتگو یا تقریر کو ضروری تدوین کے بعد بعینہٖ نقل کر دیا جاتا ہے۔

''المورد'' کی مطبوعات میں اِس کی مثال راقم (سید منظور الحسن) کے درج ذیل مضامین ہیں:

* مدرسۃ الاصلاح سیمینار: جناب جاوید احمد غامدی کا خطاب (اشراق، جنوری 2020ء)
* پوتے کی وفات پر غامدی صاحب کے تاثرات (اشراق، نومبر 2022ء)
* اخذ دین کی بحث: غامدی صاحب سے ایک گفتگو (اشراق، نومبر 2018ء)

6۔ ترتیب و تدوین

اِن تصانیف میں کوئی تصنیفی کام نہیں ہوتا، بلکہ منتخب مضامین کی ایڈیٹنگ کر کے اور اُنھیں خاص صورت میں ترتیب دے کر شائع کیا جاتا ہے۔ اِس کی مثال ماہنامہ ''اشراق'' ہے۔

تصنیفی کام کی ملکیت

تصنیفی کام کی ملکیت کا معاملہ نہایت اہم اور قدرے پیچیدہ ہے۔ دورِ جدید کے اشاعتی مسائل نے اِس کی اہمیت اور پیچیدگی میں اضافہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ ''المورد'' کے کام کی مختلف نوعیت کی وجہ سے اِسے دیگر اشاعتی اداروں کے معاملات پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اِس معاملے میں کوئی ایسی پالیسی تو وضع نہیں ہو سکتی، جو ابہام و خطا سے پاک ہو اور جسے مستقلاً اختیار کیا جا سکے، تاہم آغازِ کار کے لیے جس پالیسی کو اختیار کرنا مجموعی طور پر مفید ہو سکتا ہے، وہ درجِ ذیل ہے:

''المورد'' کا مقصد، اُس کی تاریخ، اُس کے زیر اہتمام ہونے والی تصانیف کی نوعیت، اُس سے

وابستہ علما و مصنفین کی غیر کاروباری (non professional) خدمات اور اُس کے راس المال (capital) کا عوام الناس (public) کے تعاون پر انحصار جیسے امور متقاضی ہیں کہ تصنیف کے متن کی ملکیت کا حق مصنف کے لیے تسلیم کیا جائے۔ اِس سے قطع نظر کہ ادارہ مصنف کی رائلٹی طے کرتا ہے، کوئی مشاہرہ مقرر کرتا ہے یا اُس کے تصنیفی منصوبے کا مختانہ ادا کرتا ہے۔ اِس کی تفصیل اِن نکات پر مبنی ہے:

1۔ دعوتِ دین کے لیے تصنیف و تالیف کا کام علما کی ذمہ داری ہے۔ وہی اِس کے کار پرداز ہیں اور وہی عند اللہ اور عند الناس اِس کے بارے میں جواب دہ ہیں۔

2۔ تصنیف و تالیف کا کام تخلیق ہے۔ فطری طور پر تخلیق کا حق ملکیت تخلیق کار کے لیے تسلیم کیا جاتا ہے۔

3۔ کتاب کی تصنیف کے بعد مصنف ہی اُس کے متن کو بہتر (develop) کرنے کے لیے اُس میں ترمیم و اصلاح کر سکتا ہے۔ وہ یہ کام عمر بھر جاری رکھتا ہے اور اپنی تخلیق کو نکھارتا رہتا ہے۔

4۔ کتاب میں جو فکر پیش کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ مصنف بعد ازاں اُسے غلط سمجھ کر اُس سے رجوع کرنا چاہے اور اُسے اپنی نسبت سے دنیا میں نہ پیش کرنا چاہے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہے، جب اُسے کتاب کی ملکیت کا حق حاصل ہو۔

5۔ کتاب کے متن کی بنا پر اگر تکفیر، غداری یا دین و ملت سے انحراف کا لیبل لگتا ہے تو وہ مصنف پر لگتا ہے اور اِس کے نتیجے میں مصنف ہی کو قید، جلاوطنی یا موت کا سامنا کرنا ہے۔

6۔ ''المورد'' کے مصنفین کا مقصدِ زندگی ملازمت، کاروباری منافع یا مالی ترقی ہرگز نہیں ہے۔ وہ اِس کام کو دینی ذمہ داری کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔

7۔ دعوت دین کی ترقی اور تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ جدید نسل کے ذہین نوجوان اِس کام کو اپنا آئیڈیل بنائیں، یہ اُسی صورت میں ممکن ہے، جب اُنھیں ملازمانہ مراعات اور ملکیت میں سے کوئی ایک چیز میسر ہو۔ اگر ملازمانہ مراعات بھی محدود ہوں اور ملکیت بھی دستیاب نہ ہو تو اِس کام کے لیے وہی لوگ میسر ہوں گے، جو مقابلتاً کم صلاحیت ہوں گے یا اکا دکا وہ باصلاحیت میسر ہوں گے، جو اپنے خاندان اور معاشرے سے لڑ کر اِس کام کو اختیار کر پائیں گے۔

8۔ ادارے کے پاس جو راس المال (capital) بھی جمع ہوتا ہے، اُس کی اصل حقیقت پبلک فنڈ کی ہے۔ یہ فنڈ مصنفین اور معلمین کی شخصیت اور کارکردگی کی بنا پر میسر ہوتا ہے۔ فنڈ دینے والوں کے سامنے عموماً ادارہ یا اس کا انتظامی انفراسٹرکچر نہیں ہوتا۔ یہ چیز بھی ادارے کے مقابلے میں مصنف کے اسٹیک کو قدرے بڑھاتی ہے۔

9۔ دنیا بھر میں قائم ''المورد'' کے مختلف اداروں کی قانونی صورت یہ ہے کہ اِس میں غیر علما کاموں کے مالک اور علما و مصنفین ملازم قرار پاتے ہیں۔ اگر ادارے کو تصنیف کا مالک بنایا جائے گا تو تصنیف کی ملکیت عملاً اُن افراد کے ہاتھ میں آئے گی، جو نہ علما ہیں، نہ کل وقتی طور پر ادارے میں سرگرم عمل ہیں اور نہ اُن کا کوئی بڑا دنیوی اسٹیک ادارے سے وابستہ ہے۔

10۔ تصنیفی کام کے تین اسٹیک ہولڈرز ہیں: ایک عوام جو مال و اسباب فراہم کرتے ہیں، دوسرے ''المورد'' کی مجلس انتظام اور تیسرے مصنفین۔ عوام کو حق ملکیت دیا نہیں جا سکتا، باقی دو میں سے اگر انتخاب کرنا ہو تو دیکھنا چاہیے کہ بہ لحاظ منفعت اور بہ اعتبار تعلق کون تصنیف کے زیادہ قریب ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی

مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں۔ عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر، جو کچھ کہو عربی ہے۔ مسلمانوں کے تمام علوم و فنون اسی خزانے میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانے پر یورپ کا قبضہ ہے اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں، جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی کا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے۔ صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آ رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخے کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے، بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں، جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان کو ہمارے علما کے دماغوں میں ایک لمحے کے لیے بھی جگہ نہ ملی ہو گی، عربی کی علم اللسان، لغت، صرف و نحو، عروض اور قوانی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبانوں میں آ جائے تو بیش بہا معلومات سے مالا مال ہو جائیں۔

ڈاکٹر لائیٹز ہماری اس افسوس ناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں:

”مسلمان ہیں تو بہت، مگر وہ جانتے کیا ہیں؟ اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان درکار ہو تو یورپ سے مانگنا پڑے گا۔ ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں! تابط شرا، امرؤ القیس، بحتری اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہو گا؟ یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں“!

ڈاکٹر لائیٹز کو صرف اس کا افسوس ہے کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں اور انھیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے؟ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعے علماے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں جن کی بدولت آج انھیں اس امر کا موقع حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں...

اس مضمون کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور صرف و نحو، لغت و ادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں؟ دوسرے حصے میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی؟ اور کیوں کر ہوئی، یہ بجاے خود ایک دل چسپ مضمون ہے جس کے بیان کی یہاں نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت! صرف اس قدر بتلانا سلسلۂ مقصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا، اور کیوں کر عربی علوم و فنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہو گئے۔

دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹکل خوں ریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجے تک بلند ہو چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقع دیا کہ مسلمانوں کی

شائستگی کا مطالعہ کرے۔

بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوئی اور مسلمانوں سے ملنے ملانے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہو گئے تو یورپ کی آنکھیں کھلیں، اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا۔ شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جاں بازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی ترقیات کی دنیا میں اکیلے مخزن ہیں اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا، اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ پیدا ہو گئی اور یہ ہر مرتبہ مسلمانوں کی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے۔ اس لیے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑا اٹھایا اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہو گیا!

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور اراکین سلطنت کے لیے مخصوص تھی، اس لیے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اول قدم اٹھا وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا۔ حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفے کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی۔ حالانکہ ابتدا میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارہویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم و فنون پر یورپ کی توجہ ہوئی اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو گئیں۔ ابتدا میں متعدد محکمے قائم کیے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفے کی کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ پھر پوپ اکلرمنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ سے نوجوان طالب علم اندلس روانہ کیے گئے۔ اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی فلسفے میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لیے یورپ کے طلبا ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے۔

جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے، ان کے نام آج تاریخی صفحات پر موجود ہیں۔ ان میں بہت

سے طالب علم ایسے ہیں جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تقید سے خود کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دار العلوموں میں صرف کر دی۔ کچھ طالب علم ایسے ہیں، جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصے کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ ہارڈمن کریموں اس زمانے کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے۔ یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصے کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی، تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹر زمارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔ ڈنیل مارلی اور پیٹر زمارمٹ نے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی۔ آخر الذکر نے قرآن شریف کا عربی سے ترجمہ بھی کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں۔ ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفے نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درس گاہ نہ تھی، اس لیے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولہویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہو گئی۔ 1642ء میں پندرہویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہو گئی۔ اس کے بعد ہی 1627ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پا کر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جا

سکیں۔ اس مدرسے میں خاص طور پر عربی اور سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے۔ عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسے کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں۔ تعلیم کے لیے ضرورت ہوئی کہ صرف و نحو اور ادب کی کتابیں بہ کثرت مہیا ہوں، اس لیے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے اور کچھ کتابیں قدیم زمانے میں لکھی ہوئی دستیاب کیں اور انھیں نہایت اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

نفس کا یہ دھوکا ہے

(شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ناموس رسالت کے جذبات کے اظہار پر تبصرہ)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے درس کا ایک واقعہ سناتے ہیں:

"بخاری شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ مشہور حدیث گزری کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے مال، بال بچے اور سارے انسانوں سے زیادہ میں اس کے لیے محبوب نہ ہو جاؤں۔

فقیر نے عرض کیا کہ "بحمد اللہ عام مسلمان بھی سرکارِ کائنات کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو ایک حد تک مسلمان برداشت کر لیتا ہے، لیکن رسالت ماب کی ہلکی سی سبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کر دیتی ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں، آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جان پر لوگ کھیل گئے ہیں۔"

یہ سن کر حضرت نے فرمایا: "ہوتا بے شک یہی ہے جو تم نے کہا۔ لیکن کیوں ہوتا ہے؟ تہ تک تمھاری نظر نہیں پہنچی، محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے، لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آں حضرت کی مرضئ مبارک کے ساتھ ہے وہ بھی ہمارے تمھارے سامنے ہے۔ پیغمبر نے ہم سے کیا چاہا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے، پھر سبکی آپ کی جو مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے اس کی وجہ محبت تو نہیں

ہو سکتی۔ ‘‘

خاکسار نے عرض کیا کہ تو آپ ہی فرمائیں، اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟ نفسیاتِ انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ ’’سوچو گے تو در حقیقت آں حضرت کی سبکی میں اپنی سبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی خودی اور انا مجروح ہوتی ہے۔ ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے۔ چوٹ در حقیقت اپنی اسی ’انانیت‘ پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کی محبت نے ان کو انتقام پر آمادہ کیا ہے۔ نفس کا یہ دھوکا ہے... محبوب کی مرضی کی جسے پروانہ ہو، اذان ہو رہی ہے اور لایعنی اور لاحاصل گپوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کر کے مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ اس کے منہ پہ کس حد تک پھبتا ہے۔‘‘

(کتاب: احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی)

مولانا وحید الدین خان

شکایت ایک نفسیاتی کمزوری

شکایت کا سبب کوئی انسان نہیں، اس کے اسباب خود قانون فطرت کے اندر ہیں۔ جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں یا مل کر کوئی کام کریں تو لازماً ایک کو دوسرے سے ناخوش گوار تجربات ہوتے ہیں۔ یہی تجربات شکایت پیدا کرتے ہیں۔ اب جو آدمی شکایت کو فطرت کے نظام کا ایک تقاضا سمجھے وہ اس کو نظر انداز کر دے گا اور جو آدمی شکایت کو ایک شخص کا فعل سمجھ لے وہ اس کے خلاف شکایت میں مبتلا ہو جائے گا۔

کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ہمیشہ متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی کچھ لوگ متحد ہوں گے تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت بھی پیدا ہو گی۔ اب اگر ایسا ہو کہ لوگ شکایتوں کو لے کر ساتھ چھوڑ دیں تو کبھی کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ بڑا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ شکایت کے باوجود متحد رہیں، شکایت کے باوجود وہ مقصد کی خاطر دوسروں سے جڑے رہیں۔

اس معاملے کا دوسرا سخت تر پہلو ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں شکایت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لیے شکایتی مزاج کے لوگ عملاً ڈبل اسٹینڈرڈ بن جاتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے ہیں کہ جہاں ان کا گہرا انٹرسٹ وابستہ ہو، وہاں تو وہ شکایت کو نظر انداز کر کے جڑے رہتے ہیں۔ اور جہاں گہرے انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ فوراً شکایت لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شکایتی مزاج ایک قسم کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اس نفسیاتی کمزوری کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ یہ نیکی بھی اس کے لیے مقدر نہیں کہ کوئی شخص ایک بڑا کام کر رہا ہو تو وہ

اس کا اعتراف کرے۔ کیونکہ اپنے مزاج کی بنا پر اس کو کوئی نہ کوئی ایسی شکایتی بات مل جائے گی جس کا حوالہ دے کر وہ اس کو رد کر دے اور اس سے الگ ہو جائے۔

[الرسالہ، مئی 2001ء]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

اشہد ان لا الٰہ

میری نوا کا ثبات، اشہد ان لا الٰہ
قلب و نظر کی حیات، اشہد ان لا الٰہ
عالم نو ہے مگر آج بھی ہوں نغمہ زن
توڑ کے لات و منات، اشہد ان لا الٰہ
شوکت فغفور و کے، سلطنتِ روم و رے
موت ہے اس کی برات، اشہد ان لا الٰہ
تو ہے مسلماں تو ہیں ایک ہی دریا کی موج
دجلہ و نیل و فرات، اشہد ان لا الٰہ
پھر وہ اذانِ سحر، ڈھونڈ رہی ہے جسے
تیرے شبستاں کی رات، اشہد ان لا الٰہ
علم و ہنر کا فسوں، عشق کا زورِ جنوں
بندۂ حق کی نجات، اشہد ان لا الٰہ
درد کا درماں بھی یہ، عشرتِ دوراں بھی یہ
تلخی غم میں نبات، اشہد ان لا الٰہ

فرحان سید

جوابی بیانیہ

جو پوچھتے ہو کہ اس میں کیا ہے
یہ کس کے دکھ درد کی دوا ہے
تو آؤ بیٹھو دکھاوں تم کو
ہے کیسی الجھن بتاؤں تم کو
میں کھو گیا ہوں میں بے نشاں ہوں
میں کس سے پوچھوں کہ میں کہاں ہوں
پتا جو میرا بتا رہے ہیں
جو مجھ کو رستہ دکھا رہے ہیں
میں سن رہا ہوں میں دیکھتا ہوں
پر ایک مشکل میں سوچتا ہوں
جسے یہ کہتے ہیں دیں کا رستہ
نہیں رہا وہ کہیں کا رستہ
جو آئینہ یہ دکھا رہے ہیں
یہ مجھ کو مجھ سے ڈرا رہے ہیں
اس آئینے میں ہے ایک حیواں
کسی طرح بھی نہیں جو انساں

ہمیں سبق یہ پڑھا رہے ہیں
یہ حکمِ رب ہے، جتا رہے ہیں
عرب خدا کا عجم خدا کا
زمیں خدا کی علم خدا کا
سو لاؤ تلوار سر اڑا دو
بتانِ کفر و ریا کو ڈھا دو
جہاں مسلماں نہیں ریاست
ہر اس حکومت کو تم گرا دو
جو امن کی بات کر رہے ہیں
یہ سارے بزدل ہیں ڈر رہے ہیں
ہیں کفر کے یہ چراغ سارے
لہو سے ان کے انھیں بجھا دو
یہ کافروں کے امام پکڑو
اور ان کا نام و نشاں مٹا دو
یہ میرے قرآں کی آیتیں ہیں
مرے نبی کی روایتیں ہیں
جنھیں یہ پڑھ پڑھ سنا رہے ہیں
خدا کی مرضی ہو اور شاید
یہ اور معنی بتا رہے ہیں
یہ میرا سارا وجود اوڑھے
مری نمازیں درود اوڑھے
جلا رہے ہیں مٹا رہے ہیں
ہے اک قیامت جو ڈھا رہے ہیں
کوئی بتائے کہ سب یہ کیا ہے؟

کہ دیں میں یہ ظلم کیوں روا ہے
رحیم و رحماں اگر خدا ہے
جو دل کے احوال جانتا ہے
اگر وہ عادل ہے بے خطا ہے
تو اس نے یہ حکم کیوں دیا ہے؟
کوئی بتائے کہ سب یہ کیا ہے؟
کوئی نیا ہو یا ہو پرانا
ہو کوئی عامی یا کوئی دانا
ہے سوچ جس کی مخالفانہ
پھر اس کا دوزخ ہی ہے ٹھکانا
یہ حقِ تکفیر کا چرانا
یہ بے قصوروں کا خوں بہانا
یہ میری فطرت قبول کر لے؟
جو دے رہے ہیں وصول کرلے؟
نہیں نہیں یہ نہیں ہے ایسا
نبی خدا کا نہ دیں ہے ایسا
خدا کا قرآن پڑھنے والے
نبی پہ ایمان رکھنے والے
خدا کی بستی جلا رہے ہیں؟
یہ کیسی دنیا بنا رہے ہیں؟
ہماری آنکھوں میں اک نشانِ سوالیہ ہے
ہے بوجھ دل پر کہ جیسے کوہِ ہمالیہ ہے
ہے دین کیا اور ہم نے کیسا بنا لیا ہے
وہ زہر کیا ہے جو ہم نے چپکے سے کھا لیا ہے

سبھی سوالوں کا ہے مدلل جواب اس میں
ملے گی حکمت بھی اور تم کو کتاب اس میں
یہ شب کی ظلمت کو دور کرتا ہوا دیا ہے
یہ سب اندھیروں کا اک جوابی بیانیہ ہے

نعیم بلوچ

کرن کاربن

[آٹھ سے بارہ برس کے بچوں کے لیے کہانی]

وہ آج پھر سخت پریشان ہو رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، مگر اس کاربن مل ہی نہیں رہا تھا... اس نے جو فراک پہنا تھا، جو نئی جرابیں اور جوتے پہنے تھے، سب میچنگ (ایک رنگ کے) تھے۔ اب اگر ربن کسی اور رنگ کا لگا لیتی تو کتنا برا لگتا!

''ہائے میرا نیا ربن کہاں گیا!'' اس نے رونی آواز میں کہا۔

لیکن اس ساری مصیبت کا ذمے دار کون تھا؟ کیا کسی نے اس کا ربن چرا لیا تھا یا جان بوجھ کر چھپا لیا تھا؟ ایسی کوئی بات نہیں تھی... بات صرف اتنی تھی کہ اسے اپنی چیزیں اِدھر اُدھر پھینکنے کی عادت تھی۔ وہ کوئی چیز سلیقے سے نہیں رکھتی تھی۔ اسکول سے آئی، بیگ کہیں پھینکا، کوٹ کہیں اتارا، بالوں کا کلپ اگر باورچی خانے میں اتارا تو وہیں رکھ دیا۔ ایک جراب بیڈ روم میں اتاری تو دوسری ٹی وی والے کمرے میں! اس کی اس عادت سے ہر کوئی تنگ تھا۔

اب وہ پریشان تھی کہ ربن کہاں رکھ بیٹھی ہے؟ کمرے میں ہر جگہ تلاش کے بعد بھی جب اسے ربن نہ ملا تو اس نے رونے کے ساتھ ساتھ چِلانا بھی شروع کر دیا۔

''کیا مصیبت ہے! میری چیزوں کو کون گم کرتا ہے؟''

اچانک اسے خیال آیا کہ پلنگ کے نیچے دیکھا جائے کہ کہیں سوتے ہوئے نیچے نہ گر پڑا ہو۔ لیکن پلنگ کے نیچے ربن نہ ملا۔

پھر اچانک اس کی آواز آئی...

''اوہو! یہ کیا؟ اسے تو میں بہت دنوں سے تلاش کر رہی تھی...!''

اسے اپنے جیولری بکس کا ڈھکنا مل گیا۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے بولی: ''اچھا ہوا کہ مل گیا۔'' اس نے ڈھکنا جیولری بکس میں رکھا اور پھر ربن کی تلاش شروع کر دی۔ اب اس نے الماری کی درازوں میں دیکھنا شروع کیا، لیکن ربن کے بجائے اسے اپنی گھڑی نظر آ گئی۔

''شکر ہے گھڑی کی شکل دیکھی! کئی دنوں سے نہیں مل رہی تھی۔'' کرن نے اسے اپنی کلائی پر لگاتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں دیکھوں؟'' وہ سوچنے لگی۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے قالین کے نیچے دیکھا۔ وہاں اسے کوئی چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔

''یہ تو میری ٹرین کی چابی ہے!''

اس نے خوشی خوشی چابی لی اور کھلونوں والی الماری کی طرف گئی۔ ٹرین میں چابی لگانے کے بعد وہ دوبارہ ربن کی تلاش میں لگ گئی۔

اب اسے ردی کی ٹوکری کا خیال آیا، لیکن ربن تو اسے وہاں بھی نہ ملا۔ البتہ اسے اپنی گڑیا کا کھویا ہوا جوتا مل گیا، جس کو وہ پورے ہفتے سے تلاش کر رہی تھی۔ اس نے جوتا گڑیا کے پاؤں میں پہنایا اور پھر ربن ڈھونڈنے لگی۔

اس دفعہ اسے اپنے اسکول بیگ کا خیال آیا۔ اسکول بیگ میں بھی ربن نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی مگر وہاں اسے اپنا پنسل تراش مل گیا، جسے اس نے کل بہت تلاش کیا تھا۔ پنسل تراش ملنے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر ربن تو اسے ابھی بھی نہ ملا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر چیزیں الٹنے پلٹنے لگی۔ اب اس کے ذہن میں کپڑوں کی الماری کا خیال آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی الماری کی طرف گئی۔ لیکن ربن وہاں ہوتا تو اسے ملتا، مگر اس دفعہ الماری سے اسے اپنے بالوں کا کلپ مل گیا۔ یہ کلپ بہت قیمتی تھا، اس کے ماموں نے اسے دیا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا اور پھر ربن کے متعلق سوچنے لگی۔ وہی ایک آخری چیز رہ گئی تھی۔

''وہ ضرور کھلونوں کے ڈبے میں ہو گا، اور کہاں ہو سکتا ہے۔ اب تو میں نے ایک ایک چیز دیکھ ڈالی ہے۔''

کرن نے یہ سوچتے ہوئے جب کھلونوں کا ڈبہ دیکھا تو ربن وہاں بھی موجود نہ تھا، لیکن اس دفعہ اسے اپنی کوئی گم شدہ چیز بھی نہ ملی۔ اسے بہت غصہ آیا۔ تھک ہار کر وہ امی کے کمرے کی طرف دوڑی اور جاتے ہی زور سے چلائی:

''امی...! میرا ربن کہاں ہے؟ مل ہی نہیں رہا، جیولری بکس کا ڈھکن، گھڑی، ٹرین کی چابی، گڑیا کا جوتا، پنسل تراش، بالوں کا کلپ... تمام چیزیں مل گئی ہیں، لیکن یہ ربن کہیں سے نہیں ملا... مجھے پارٹی سے دیر ہو رہی ہے''

امی، کرن کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں... پھر بولیں... ''معلوم ہے ربن کیوں گم ہوا؟''

''نہیں تو... آپ بتائیں...'' کرن نے اپنی گول گول آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ تمھاری تمام چیزیں مل جائیں۔''

''ہاں امی چیزیں تو مل گئی ہیں، لیکن میرا ربن! ہائے اللہ'' کرن نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی مل جائے گا، لیکن اس کے لیے تمھیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔'' اس کی امی نے کہا۔

''ہاں میں کرتی ہوں وعدہ! آپ بتائیں نا، جلدی کریں۔ مجھے ناہید کی سالگرہ پر جانا ہے، دیر ہو رہی ہے'' کرن نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی امی نے کہا: ''تم وعدہ کرو کہ آیندہ سے اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھو گی، ادھر اُدھر نہیں پھینکو گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔ میری توبہ! واقعی یہ بہت بری عادت ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے پارٹی سے دیر ہو رہی ہے اور اسکول سے بھی اکثر دیر ہو جاتی ہے۔''

''پکا وعدہ کر رہی ہو نا؟''

''جی امی، بالکل پکا وعدہ۔ اگر میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہی تو آپ بے شک مجھے اس دن جیب خرچ نہ دیں۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔

''بالکل ٹھیک، لیکن تمھارا ربن میرے پاس نہیں ہے، بلکہ تمھارے ہی پاس ہے۔''

''میرے پاس؟... ہائیں...'' کرن سٹپٹا گئی۔

''تمھارے بالوں میں!'' امی نے کہا۔

کرن نے سر پر ہاتھ رکھا تو ربن وہیں تھا۔

سید منظور الحسن

پانچ نمازیں

[بخاری کی روایت، رقم 528 سے ماخوذ]

حدیثِ پیمبر سنو دوستو
یہ حکمت کے موتی چنو دوستو
روایت بخاری میں مرقوم ہے
بہت دل نشیں اِس کا مفہوم ہے
نبی نے صحابہ سے اک دن کہا:
”ذہن وا کرو اور سوچو ذرا!
کوئی شخص رہتا ہو ایسی جگہ
جہاں کا سماں ہو بہت پُر فضا
نہر گھر کے آگے ہو ایسی رواں
بہے جس میں پانی سدا بے کراں
اگر روز اپنا بنا لے شعار
نہر میں کرے غسل وہ پانچ بار
بدن پر رہے گی ذرا میل کیا؟
بتاؤ صحابۂ صدق و صفا!“

کہا سب صحابہ نے بے ساختہ:
"ملے گا نہ پھر میل کا کچھ پتا!"
یہ سن کر پیمبر نے اُن سے کہا:
"سنو، غور سے مژدۂ جاں فزا!
یہ پانچوں نمازوں کی تمثیل ہے
خفی اِس میں ایماں کی تفصیل ہے
گنہ کو نمازیں دھوئیں اِس طرح
نجاست کو آبِ رواں جس طرح"

شاہد محمود

خبر نامہ ''المورد امریکہ''

ڈاکٹر خالد ظہیر کی ڈیلس (امریکہ) آمد

جناب جاوید احمد غامدی کے دیرینہ شاگرد اور معروف دینی اسکالر ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کی دعوت پر گذشتہ ماہ ڈیلس تشریف لائے۔ اُن کی آمد کا مقصد نوجوانوں کے ایک گروپ کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔ مختلف نوجوانوں نے تقریباً 10 دن ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزارے۔ اُن سے علمی سوالات پوچھے، اخلاقی مسائل پر گفتگو کی، ذاتی معاملات پر مشاورت کی۔ مقصود یہ تھا کہ نوجوان علماے دین کے ساتھ دوستانہ ماحول میں وقت گزاریں، اُن سے دین کی علمی، عملی اور اخلاقی، تینوں طرح کی چیزوں کو سیکھیں۔ نتائج و اثرات کے اعتبار سے یہ ایک مفید تجربہ ثابت ہوا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اِس طرح کے پروگراموں کو مستقل صورت دینی چاہیے۔

''اپنا'' کے سالانہ اجتماع میں غامدی سینٹر کی نمایندگی

گذشتہ ماہ ڈیلس میں نارتھ امریکہ کے ڈاکٹروں کی تنظیم ''اپنا'' کا اجتماع منعقد ہوا۔ اِس میں دنیا بھر سے ہزاروں ڈاکٹر شریک ہوئے۔ اِس موقع پر تنظیم نے ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کے علما کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ جناب جاوید احمد غامدی اور محمد حسن الیاس صاحب شریک

ہوئے۔ دو گھنٹے پر مشتمل سیشن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکا کے سوالوں سے اندازہ ہوا کہ جدید ذہن میں مذہب کے بارے میں پیاس موجود ہے اور غامدی صاحب کے اندازِ فکر کی بہ دولت اُن کا دین پر اعتماد بڑھ رہا ہے۔ اجتماع میں غامدی سینٹر کا اسٹال بھی لگایا گیا۔ لوگوں نے کتب میں خاطر خواہ دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔

ویسٹرن سڈنی یونیورسٹی آسٹریلیا کے اساتذہ کی غامدی سینٹر آمد

ویسٹرن سڈنی یونیورسٹی آسٹریلیا یونیورسٹی سڈنی کے شعبۂ علوم اسلامی کے اساتذہ کے ایک وفد نے غامدی صاحب اور حسن الیاس صاحب سے ملاقات کی۔ اسلامک فنانس کے حوالے سے مختلف تحقیقی منصوبوں پر رہنمائی حاصل کی۔ اُنھوں نے اس امر کا اظہار بھی کیا کہ وہ غامدی صاحب کے معاشی افکار پر تحقیقی کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔

23 اعتراضات کے جواب میں: ”سنت کیا ہے؟“ کی تکمیل اور ”حدیث کیا ہے؟“ کا آغاز

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ”سنت کیا ہے؟“ کا موضوع گذشتہ ماہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہ سلسلہ چند ماہ سے جاری تھا، جو 19 سیشنز میں مکمل ہوا۔ اِس کے بعد ”نزولِ مسیح“ کے ضمیمہ کی ایک قسط ریکارڈ ہوئی اور اس کے بعد ”حدیث کیا ہے؟“ کے زیرِ عنوان اگلے موضوع کا آغاز ہو گیا ہے۔ سنت کی طرح حدیث کا موضوع بھی مدرسۂ فراہی کے اہم اور نمایندہ موضوعات میں سے ہے۔

”اوکھے (مشکل) سوالات“: حسن الیاس صاحب سے ایک مکالمہ

پاکستان کے معروف دانش ور اور لز یونیورسٹی لاہور کے استاد ڈاکٹر تیمور رحمان صاحب نے اِس عنوان کے تحت حسن الیاس صاحب کے ساتھ سوال و جواب کا ایک تفصیلی سیشن کیا۔ یہ سیشن زوم کے ذریعے سے آن لائن ریکارڈ کیا گیا۔ اس میں مذہب، سائنس، الحاد اور سیاست، معیشت، معاشرت کے حوالے سے نازک اور پیچیدہ سوالات کو زیرِ بحث لایا گیا۔ یہ پروگرام یوٹیوب پر نشر ہوا تو اسے بہت پذیرائی ملی۔ اسے جی سی ائی ایل اور ڈاکٹر تیمور رحمان کے چینلز پر ملاحظہ کیا

جاسکتا ہے۔

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

جی سی آئی ایل کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہ جولائی میں 8 نشستوں کا انعقاد ہوا۔ غامدی صاحب نے ان نشستوں میں سورۂ نحل (16) کی آیات 1 تا 36 کا درس دیا۔ درسِ حدیث میں ''دوزخ کے اعمال'' کے موضوع پر مختلف احادیث کی شرح و وضاحت کی گئی۔

کیا خدا کا وجود عقل سے ثابت ہو سکتا ہے؟

اِس عنوان کے تحت تین پروگرام ریکارڈ اور نشر کیے گئے۔ اِن میں حسن الیاس صاحب نے غامدی صاحب سے اُن سوالوں پر بحث کی ہے، جو فلسفے اور سائنس کے تناظر میں پیدا ہوتے ہیں اور جدید پڑھے لکھے طبقے میں باری تعالیٰ کے وجود کے حوالے سے الجھنوں کا باعث بنتے ہیں۔

دنیانیوز کے لیے ''علم و حکمت'' کے پروگراموں کی ریکارڈنگ

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' دنیانیوز چینل پاکستان کا ایک معروف پروگرام ہے، جو کئی برس سے نشر ہو رہا ہے۔ یہ ڈیلس میں ریکارڈ ہوتا ہے اور ہفتہ وار نشر ہوتا ہے۔ میزبانی کے فرائض حسن الیاس صاحب انجام دیتے ہیں۔ جولائی 23 میں 4 پروگرام ریکارڈ کیے گئے اور دنیانیوز سے نشر ہوئے۔ ان میں اسلامی ریاست کے حوالے سے بعض اہم سوال زیر بحث آئے۔ اس ماہ کی آخری نشست میں دین کے بارے میں جدید ذہن کے شبہات کو ڈسکس کیا گیا۔

نوجوان کیسے کامیاب ہوں؟

نوجوان نسل ہمارا مستقبل ہے۔ اُسے دینی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ اِسی مقصد کے پیش نظر ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' وقتاً فوقتاً اہل علم و دانش کو مدعو کر کے اُن کے ساتھ نوجوانوں کے مکالموں کا اہتمام کرتا ہے۔ اِس ضمن میں چند ماہ پہلے سید منظور الحسن ملایشیا سے اور ڈاکٹر عدنان ذوالفقار فیلڈیلفیا (امریکہ) سے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ نوجوان نسل کے نمایندوں محمد بشار الیاس اور شارق بٹ نے کئی نشستوں میں مختلف

موضوعات کو ڈسکس کیا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے گذشتہ ماہ جناب یوسف غنی کے ساتھ اسی طرز کی نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ محمد بشار الیاس نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ ان کا مرکزی خیال یہ تھا کہ نوجوانوں کے ان مسائل کو زیر بحث لایا جائے، جن میں اُنھیں فیصلے کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ شادی اور جیون ساتھی کا انتخاب انھی میں سے ایک ہے۔ اس موضوع پر یوسف غنی صاحب نے اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں سیر حاصل گفتگوئیں کیں۔ اِن کا پہلا حصہ نشر ہو چکا ہے۔

''المورد'' کینیڈا کے احباب کی غامدی صاحب سے آن لائن ملاقات

''المورد'' کینیڈا کے رفقا و احباب نے غامدی صاحب سے ایک تفصیلی ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس ملاقات میں اُنھوں نے بعض انتظامی معاملات میں اصولی رہنمائی حاصل کی۔ علاقائی سطح پر دعوت کے کام میں آنے والے مسائل پر گفتگو کی اور اُسے آگے بڑھانے کے لیے بعض عملی معاملات پر تبادلۂ خیال کیا۔ غامدی صاحب نے ان کے خیالات کو توجہ سے سنا اور اپنی اصولی آرا سے انھیں آگاہ کیا۔ اس دوران میں بعض علمی و فکری سوالات بھی زیر بحث آئے۔

''ناسخ و منسوخ'' کے موضوع پر سلسلۂ مباحث

ہمارے روایتی علوم القرآن میں ''ناسخ و منسوخ'' کی بحث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ امت کے جلیل القدر علما نے اس پر کلام کیا ہے۔ برصغیر کے امام شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ اس موضوع پر غامدی صاحب کے موقف کو تفصیل سے جاننے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا جناب حسن الیاس نے 7 نشستوں پر مشتمل اُن سے گفتگو کی اور موضوع کے تمام اجزا و متعلقات پر اُن کی آرا کو ریکارڈ کیا۔ یہ ریکارڈنگ ہمارے یوٹیوب چینل پر دستیاب ہے۔

حسن الیاس صاحب کا ''وائس آف امریکہ'' کو انٹرویو

''وائس آف امریکہ''، امریکہ کا سرکاری نیوز نیٹ ورک ہے۔ اِس کی نشریات دنیا بھر میں تقریباً 30 زبانوں میں نشر ہوتی ہیں۔ اس کی طرف سے اردو نشریات کے لیے حسن الیاس صاحب کا انٹرویو کیا گیا۔ اس انٹرویو کا موضوع پاکستان میں بعض مذہبی گروہوں کے ساتھ امتیاز

(discrimination)اور مذہبی جبر (persecution) کے معاملات تھے۔ حسن الیاس صاحب نے انھیں خلاف اسلام قرار دیا۔ یہ انٹرویو ارم عباسی صاحبہ نے کیا۔

”خیال و خامہ“ کی شاعری غامدی صاحب کی آواز میں

”خیال و خامہ“ جناب جاوید احمد غامدی کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کی نظموں اور غزلوں کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں پڑھا ہے۔ حسن الیاس صاحب نے غامدی صاحب سے باصرار درخواست کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنا کلام اپنی آواز میں ریکارڈ کرا دیں۔ خوش قسمتی سے غامدی صاحب نے اسے قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ”خیال و خامہ“ کی شاعری کے 5 اجزا تیار ہو کر نشر ہو چکے ہیں۔ اس کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے نو تعمیر شدہ اسٹوڈیو میں ہوئی ہے۔ ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن حسن الیاس صاحب کی زیر نگرانی ادارے کا آڈیو ویڈیو ڈپارٹمنٹ انھیں پوری محنت سے تیار کر رہا ہے۔

اردو زبان کی ضرورت اور اہمیت پر حسن الیاس صاحب کا انٹرویو

”وائس آف امریکہ“ کے ایک صحافی آفتاب بورکا صاحب نے حسن الیاس صاحب کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا ہے۔ اس میں اردو زبان کی ضرورت و اہمیت پر گفتگو ہوئی ہے۔ حسن صاحب نے اردو زبان کے انحطاط کو قومی المیے سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کے نزدیک ہماری مذہبی روایت اور تہذیبی اقدار کے تسلسل کا انحصار اردو زبان کے احیا پر ہے۔

اس انٹرویو میں انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی اہمیت کو اجاگر کیا، بلکہ اُن اداروں کا تعارف بھی کرایا، جو بچوں میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

”بچے کی دعا“

یہ غامدی صاحب کی ایک خوب صورت نظم ہے۔ ”المورد“ امریکہ اور ”المورد“ آسٹریلیا نے باہمی اشتراک سے اس دعا کو جدید انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم دینی اور اخلاقی تعلیم پر مبنی ہے اور اسے دیدہ زیب visuals کے ذریعے سے دل کش بنایا گیا ہے۔ بچوں میں یہ نظم کافی مقبول ہوئی ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ“ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 13 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔